جنوری سنہ ۱۹۱۰ء
جلد ۱۸ - نمبر ۴
ایڈیٹر: شیخ عبد القادر
شیخ محمد اکرام

# مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہواری رسالہ

## نثر



## نظم

مولوی خدا بخش سی۔ آئی۔ ای۔ مرحوم

اکثر علوم قدیمہ کی نسبت عموماً یہ غلطی کیجاتی ہے کہ خاص خاص اشخاص کو اون کا موجد سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص واحد نے ایک زمانہ معین و مدت مقررہ میں اُس علم کے تمام مسائل کو دریافت و منضبط و مدوّن کیا۔ اس غلطی کا منشا صرف یہ ہے کہ اِن علوم کی نہ تو تاریخ ارتقا لکھی گئی نہ صدیوں تک اِن کے مسائل ہی قید تحریر میں آئے، علما و حکما میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے، عام لوگوں کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک اِن کی کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی لہذا جس شخص نے سب سے اول ضبط تحریر میں لاکر ان اسرار حکمت کو فاش کیا اور عامّہ خلائق کو اُن سے متمتّع اور بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا وہی انکا موجد مشہور ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم ارسطو کو منطق کا اور حکیم اقلیدس کو اُس علم کا جو اسی خیال باطل کی بنا پر خود حکیم موصوف کے نام سے موسوم ہے موجد کہا

جاتا ہے۔ اِس خیال کی رکاکت جو "قصرِ ریگ رواں" کی طرح بے بنیاد اور محض جہالت و توہم کی ایجاد ہے۔ محتاج بیان و برہان نہیں۔ اول تو تمام علوم بشری کی سست رفتاری سے بغایت مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص واحد کسی علم کے تمام اون مسائل کو جو اوس کی طرف منسوب ہیں اپنی زندگی کی نہایت مختصر مدت میں دریافت کر سکا ہو۔ دوسرے گو ان مسائل کی مفصل و مسلسل تاریخ مفقود سہی باز ہم موجد معروف کے زمانہ سے تو صدیوں پہلے اُن کے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ حکیم اقلیدس اسکندریہ کا رہنے والا اور بطلیموس اول شاہ اسکندریہ کے درباریوں میں تھا ۳۲۳ سنہ ق ع اُس کا سال ولادت اور ۲۸۳ سنہ ق ع سال وفات ہے اُسنے اشکالِ ہندسی کی ترتیب و تہذیب کرکے بنی نوع پر جو احسان کیا ہے کس کی مجال ہے کہ اُس سے انکار کر سکے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ افلاطون کے دروازہ کا وہ کتبہ جو ہر ایک علم ہندسہ سے ناواقف شخص کو اندر آنے سے منع کرتا تھا تقریباً ایک صدی پیشتر ہی اس علم کے نہ صرف موجود بلکہ مقبول ہونے کی باآوازِ بلند شہادت دے رہا تھا۔

ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ اس زمانہ کے اکثر قومی عظمت کے جھوٹے گیت گانے والوں کی طرح جو زمانۂ حال کی عجیب سے عجیب ایجاد کا بھی اپنی قومی تاریخ میں پتہ چلا لیتے ہیں ان اصول علمی کے جمع و تدوین کرنے والے حکما کے کارناموں کی یہ کہکر منزلت گھٹائیں کہ انہوں نے ان خیالات کو دماغ سے کاغذ پر لاکر اور حاشیہ چڑھا کر کونسا فلک پر تیر مارا بہت سے دانشمندان سے صدیوں پہلے ہی واقف تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی فرد واحد کو کسی علم کا موجد سمجھنا خود اوس

علم کی کسرشان اور اُس میں وقتاً فوقتاً اضافہ کرنے والے علما و حکما کے ساتھ سخت ناانصافی ہے +

یوں تو انسانوں کی طبیعتوں میں اوتنا ہی اختلاف ہی جتنا اُن کی صورتوں میں مگر ہم کو اِس اختلاف کی صرف ایک شاخ کا تھوڑا سا ذکر کرنا ہے یہ مسلم اور مشہور بات ہے کہ ہر شخص کی طبیعت کو بعض علوم سے خاص مناسبت ہوتی ہے اور بعض سے منافرت۔ یورپ کے علمی ترقی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہاں اِس قاعدہ کا لحاظ کیا جاتا ہے اور اکثر لوگ اونہیں کے تحصیل میں وقت و ہمت کو صرف کرتے ہیں جن سے اُن کی طبیعتوں کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ بخلاف اِس کے ہندوستان میں ہر شخص وہی علم سیکھنے میں اوقات عزیز ضائع کرتا ہے جو کسب معاش کا سب سے سہل ذریعہ معلوم ہوتا ہے چاہے طبیعت کے موافق ہو یا مخالف۔

چونکہ اسطرح بے سمجھے سوچے اختیار کیا ہو علم اکثر مخالف طبع ہی نکلتا ہے اِس مخالفت کی وجہ سے اوس میں حسب دلخواہ ترقی نہیں نصیب ہوتی ، اور عدم رغبت کے سبب سے اُس کے چھوٹے چھوٹے مسائل کا سمجھنا بھی کوہِ بے ستون کا کاٹنا اور لوہے کے چنے چبانا معلوم ہوتا ہے۔ لہذا نہ صرف دوسرے لوگ بلکہ خود متعلم بھی اسکو اپنی بد ذہنی پر محمول کر لیتا ہے اور یہہ خیال جو پاسے طلب کے لئے آرے سے کم نہیں آخر کمر ہمت توڑ دیتا ہے +

اکثر شاعروں اور ادیبوں کی نسبت مشہور ہے کہ علوم ریاضی اور خصوصاً اقلیدس کے نام سے متنفر تھے۔ خوش قسمتی سے یہہ لوگ ادبیات کے ترک اور علوم ریاضی کے اختیار کرنے پر مجبور نہوئے۔ وہ یقینی امر ہے کہ

کسی گوشہ خمول میں مرگئے ہوتے اور دنیا اُن کے لطائف رنگین و ظرائف نمکین سے بے بہرہ رہجاتی۔ اسوقت انکی جودت طبع، نازک خیالی، اور رسائی ذہن سے کسی کی مجال نہیں۔ کہ انکار کرسکے لیکن اگر ان کی شگفتہ طبیعتیں اقلیدس کے روکھے پھیکے مسائل کے اخذ پر مجبور ہوتیں تو ضرور بھدی اور نارسا ثابت ہوتیں طبیعت کی کسی چیز کی طرف رغبت یا اوس سے نفرت کے اسبا کا پتہ لگانا عموماً تو بہت مشکل ہے۔ مگر شاعروں اور ادیبوں کے نکتہ سنج دقت پسند طبیعتوں کے ریاضی کے سلجھے ہوئے مسائل سے گھبرانے اور اوبھنے کی وجہ تو چنداں محتاج تلاش نہیں۔ یعنے جو طبیعتیں رنگینی خیالات، نمکینی مضامین، حسن ادا، صفائے بیان، تشبیہ و استعارہ، دقت و نزاکت، جودت و جدت، فصاحت و بلاغت کی عادی ہوں اُنکو مسائل ریاضی سے جن میں اِس بیت کیطرح

دندان تو جملہ در دہان اند۔
چشمان تو زیر ابروان اند۔

امور واقعی کا سیدھا سادھا بیان ہوتا ہے اور الفاظ و معانی دونوں کی تکرار کی بھرمار، کیا خاک دلچسپی ہوسکتی ہے۔ جو شخص قلیہ و قورمہ و کوفتہ و کباب، مزعفر و بریانی، شیرمال و باقرخانی وغیرہ الوانِ نعمت کے مزے اوڑا چکا ہو اوسکو روکھی نان جویں کیونکر پسند ہوگی۔ جو کام و زبان سوڈا۔ اور لیمنڈ جنجر ادرر اسپ بیری، سانڈر اور پک می اپ، وسکی و برانڈی وغیرہ اقسام شراب کے خوگر ہوں اُن کو سادہ پانی کیونکر گوارا ہوگا۔ معمولی پانی تو درکنار دیکھو غالب مرحوم زمزم کے مقدس پانی کی نسبت کیا فرماتے ہیں۔

می بز ہا دمکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بشورابۂ زمزم نرسد

غرض کہ اِن لوگوں کے اِن علوم میں تجربہ نہ پیدا کرسکنے کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ اِن کے ذہن اِن مسائل کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ اسکا سبب اصلی صرف یہ ہے کہ عدم دلچسپی کے وجہ سے پوری توجہ اِس طرف مبذول نہیں کرسکتے اور بغیر توغل کسی علم میں مہارت بہم پہنچانا متعذر بلکہ محال ہے۔

زمانہ ماضی و حال کے ایسے شعرائے نازک خیال اور ادبائے باکمال کی مثالیں جو علوم مذکورہ کے نام سے بیزار رہے بکثرت ہیں مگر ہم ایک ایسے پرلطف قصہ پر اکتفا کرتے ہیں جو باوجود دلچسپی امید ہے کہ ناظرین کو لطف تازہ دیگا۔ گب میموریل سیریز کی بدولت جو نادر و نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں اون سے میں سے ابن مسکون کی کتاب تجارب الامم سے مولانا شبلی تنقید لکھکر پبلک کا تعارف کرا چکے ہیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کا ایک حلقہ کتاب ارشاد الاریب۔ الی معرفۃ الادیب ہے۔ اِس کتاب لاجواب کی تنقید کرنی ہمکو منظور نہیں بلکہ ایک ادیب کے اقلیدس سیکھنے کی عجیب و غریب حکایت جو اِس کتاب میں نظر سے گزری وہ بطور تمثیل درج کیجاتی ہے۔ احمد بن محمد بن ثوابہ تیسری صدی ہجری کا ایک فاضل ادیب ہے جو خلیفہ مہتدی کے عہد خلافت میں یا یکباک میمون بن ہارون کا دبیر تھا۔ اور بعد ازاں ابوصقر اسماعیل بلبل کے زمانۂ وزارت میں بابل و سوار وغیرہ کا عامل ہوگیا اور وقت ممات تک جو ۲۷۳ھ ہجری میں واقع ہوئی۔ اِسی عہدہ پر سرافراز رہا۔ وہ مبرد و بحتری کا ہمعصر اور اپنے زمانہ کا بے مثل

انشا پرداز تھا۔ اُس کے ایک دوست ابوعبیدہ نے ایک روز اوس سے
کہا کہ مبدأ فیاض سے ادب و فصاحت میں جو فضل و کمال آپ کو عنایت
ہوا ہے اگر اقلیدس پڑھکر براہان قیاسی اور اشکال ہندسے کا علم اسپر
اضافہ کر دو تو نورٌ علی نور ہو جائے۔ ابن ثوابہ نے پوچھا اقلیدس کون تھا۔
ابوعبیدہ نے جواب دیا اقلیدس ایک رومی حکیم تھا جس نے ایک نہایت
عجیب کتاب لکھی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی مختلف اشکال ہیں کہ اونسے
صرف اشیائے معلومہ ہی نہیں بلکہ غیر معلوم چیزوں کی بھی اصلی حقیقت
معلوم ہوتی ہے۔ ان کے مطالعہ سے ذہن میں تیزی، فہم میں دقت،
علم میں لطافت، حواس میں صفائی اور قوت ملاحظہ میں استواری
پیدا ہوتی ہے۔ رسم خط انہیں سے نکلا ہے اور نقطہ دار حرفوں کے
مرتبے انہیں کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ اقلیدس کی یہ عجیب تعریف
سنکر جو جہالت و توہم کا عطر مجموعہ ہے ابن ثوابہ نے حیرت و اشتیاق سے
پوچھا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا جناب یہ یوں سمجھ میں آنیکی
بات نہیں بچشم خود ان شکلوں کو ملاحظہ کیجئے اور دلائل کو سمجھئے تو حقیقت
کے چہرہ سے پردہ اوٹھ جائے اور میرے قول کی صداقت آنکھ سے
نظر آجائے۔ یہ سنکر ابن ثوابہ نے کہا میں تمکو اس معاملہ میں مختار
کرتا ہوں جو مناسب معلوم ہو وہ کرو۔ اجازت ملتے ہی ابوعبیدہ ایک
شخص کو جو قویری کے نام سے مشہور تھا اُس کے پاس لے آیا۔ اِس ملاقات
اور اپنے اقلیدس سیکھنے کی کیفیت ابن ثوابہ اپنے دوست احمد بن الطیب
کو یوں فلسفیانہ لہجہ میں لکھتا ہے۔ "آپکو جو خبر ملی بالکل سچ بلکہ برحق ہے
خدا سمجھے ابوعبیدہ سے اُس عیار مکار نے میرے دین کو غارت کرنے کی

کوشش کی تھی اور خدا اور رسول سے برگشتہ کرکے ہندسے کے پھندے میں پھنسا کر کفر و زندقہ میں گرفتار کرنا چاہا تھا +

شکر محفوظ مجھے عقل رسا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

کم بخت سے کہنے لگا کہیئے تو ایک ایسے شخص کو آپ سے ملاؤں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں کیونکہ اُسکو ایک ایسا شریف علم آتا ہے کہ اگر آپ کو سکھا دے تو آپ کا علم و فضل درجہ کمال کو پہنچ جائے۔ مینے دل میں خیال کیا ممکن ہے اِس شخص کے فیضِ صحبت سے کسی فن میں امتیاز یا کسی پسندیدہ خصلت میں کمال حاصل ہو جائے یا کم از کم کوئی ایسی بات ہاتھ لگجائے کہ ہمنشینوں اور ہمسروں میں فخر و مباہات کے لایق ہو چنانچہ لالچ میں آکر اجازت دے بیٹھا +

چلا ہے کعبہ کو آشفتہ پارسا بنکر
خدا جو بیٹھے بٹھائے اُسے خراب کرے

وہ جھٹ جا کر ایک بڈھے کھوسٹ لا بنے کھپاچ خادم دیر کو بلالایا جو ضعف و انتشار نظر کیوجہ سے بجو کی طرح دیدے چمکاتا تھا۔اور جسکی ہیئت کذائی دیکھتے ہی بے مجھے شیطان کا خیال آگیا اور بے اختیار مونہہ سے لاحول نکل گئی۔میرے یہاں اوسوقت کثرت سے بھلے آدمی جمع تھے میرے احترام پر نظر کرکے سب بوڑھے کے ساتھہ تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔

غرض جب وہ خبیث بڈھا بیٹھہ گیا تو مینے کہا مینے سُنا ہے آپ کو ہندسے یعنے اُس علم میں مہارت ہے جو فضل و کمال کا زینہ ہعقل کا آئینہ

ادہر فن کا ممد و معاون ہے۔ تہوڑا سا ذائقہ اِس کا ہم کو بھی چکھا دیجئے شاید دُنیا یا دین میں کارآمد ہو یعنے کوئی پسندیدہ صفت یا قابل فخر بات اوس سے حاصل ہو یا پارسائی و پرہیزگاری میں معین ہو جو سب سے بڑی کامیابی ہے فمن زحزح عن النار و اُدخل الجنۃ فقد فاز (کیونکہ جو آگ سے دور اور جنت میں داخل ہوا وہ ضرور کامیاب ہوا۔) اُس نے کہا دوات قلم اور کاغذ منگاؤ اور جب یہ سب چیزیں آگئیں تو ایک ذرہ سے بھی چھوٹا نقطہ کاغذ پر لگایا جو نظر تو کیا آتا ہاں آنکھ کو کچھ وہم و گمان سا ضرور ہوتا تھا۔ پہلے تو پیر کور سواد نے نرم آواز سے اپنے خیالات پریشان کا منتر اُسیر پڑھا اور اپنے جھوٹ کے پشتاروں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر کھلم کھلا جھوٹ بکنا شروع کر دیا۔ اور میری طرف رو ئے خطاب کر کے کہنے لگا۔ اے شخص یہ نقطہ وہ چیز ہے جو جزو نہیں رکھتی۔ مینے کہا قسم ہے رب کعبہ کی کہ تو نے مجھے راہ راست سے بہکایا کوئی ایسی بھی چیز ہے جس کے جزو نہوں۔ کہنے لگا جیسے شئے بسیط۔ یہ سنکر تو میں دریائے حیرت میں غرق ہو گیا اور اگر خدا ہدایت نکرتا تو قریب تھا کہ میری عقل چکرا جائے کیونکہ اُس نے ایسا لغت استعمال کیا جو مینے عمر بھر نہ کسی عرب کی زبان سے سنا تھا نہ عجمی کی حالانکہ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ زبان عرب کو کوئی مجھ سے بہتر نہیں جانتا۔ مینے پوچھا شئے بسیط کسے کہتے ہیں۔ کہنے لگا جیسے خدا اور نفس میں بے اختیار پکار اوٹھا کہ تو ملحد ہی کیا تو خدا سے مثالیں دیتا ہے حالانکہ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے۔

فلا تضربوا للہ الامثال ان اللہ یعلم و انتم لا تعلمون۔

(خدا سے مثالیں مت دو بے شک خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)

لعنت خدا کی اُس شخص پر جو تجھکو میرے پاس لایا اور عجب منحوس تھی وہ ساعت کہ تیرے قدم یہاں آئے۔ قسم ہے اُس خدا کی جو امیر المومنین کا حاکم ہے کہ میں تیرے شرک سے بری ہوں ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم بوڑھے شیطان کو میرا لاحول پڑہنا بہت ناگوار گزرا اور غصہ کی دلیری سے میری طرف دیکھکر بولا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تیری فصاحت زبانی تیری فہم کا وبال اور تیری طلاقت لسانی عقل کا عقال ہوگئی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اگر حاضرین کا خیال نہوتا جو اوس کی خرافات کو کان لگا کر سن رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دامِ مکر میں آکر اُس کے شریک گناہ ہو گئے تھے تو احمق کج مج زبان کی گدی سے زبان نکلوا کر نکال باہر کرتا۔ مگر حاضرین کے چہروں پر نظر کی تو کوئی علامت غصہ کی نہ پائی۔ دق ہو کر استفسار کیا کہ کیا آپ لوگوں کو اس پیر ترسا کے شرک پر جو بے دھڑک الحاد کا اظہار اور خدا کے مماثل پیدا کر رہا ہے غصہ نہیں آتا۔ ایک بولا کہ یہ پیر فرتوت ایک مرد حکیم ہے۔ خرد جاہل کی نسبت لفظ حکیم سنکر میرے بدن میں آگ لگ گئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا کہ حکمت آمیختہ بکفر پر خدا کی مار۔ میرا غصہ فرو کرنے اور علم ہندسہ سے بدگمانی رفع کرنے کے لیے ایک اور شخص بولا کہ میرا ایک مسلمان آشنا اس علم میں ید بیضا رکھتا ہے مجھے امید ہے کہ اوس کی اور آپ کی ملاقات بہبود اسلام کا باعث ہوگی۔ اگرچہ مثل مشہور ہے کہ لَا یُلْسَعُ الْمَرْءُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ۔ ہمیں کاٹا ہے جب سانپ نے رسی سے ڈرتے ہیں، مگر اس شخص نے اپنے ملاقاتی کی کچھ اس شد و مد سے تعریف کی کہ میرے دل میں پھر اس علم کے سیکھنے کا ولولہ

پیدا ہو گیا اور نہایت اشتیاق سے کہا کہ اِس مرد بزرگ سے ضرور ملاقات کراؤ۔ دوسرے روز وہ ایک پست قامت گندم گوں، خفاش چشم، کریہہ منظر، مکروہ لباس کو جسکے اطراف سے کربال اُڑتے ہوئے اور ناک بیٹھی ہوئی تھی بلا لایا۔ اَلظَّاھِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِن دل کہتا تھا کہ اِس قطع وضع کا انسان صاحب علم ہو ہی کیونکر سکتا ہے پھر شک ہوتا تھا کہ شاید علم ہندسہ میں کمال حاصل کرنے کے لیئے عجیب الخلقت ہونا بھی ضروری ہو غرض مینے اِس ہیولی سے پوچھا تمھارا نام کیا ہے۔ کہا ابو یحیٰی سنتے ہی جسم میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی اور ملک الموت علیہ السلام یاد آنے لگے نہایت تضرع کے ساتھ خدا سے دعا کی کہ باری تعالےٰ ہندسے سے حفظ و پناہ میں رکھنا اور اوس کی شر سے بچانا اور دفع بلا کے لیئے الحمد للہ اور معوذتین اور قل ہو اللہ زبان پر جاری ہوگئیں۔ کلام الٰہی کی برکت سے ذرا جان میں جان آئی تو مینے ہمنام ملک الموت سے کہا کہ میرا ایک دوست ایک نصرانی ہندسی کو میرے پاس لایا تھا جو خدا کے شریک و اولاد بتاتا تھا۔ اگر تمھارے ہندسہ میں اس کے سوا کوئی ایسی بات ہو کہ ذریعہ نجات و وسیلۂ رحمت ہوسکے تو بتاؤ کیونکہ آخر کی تجارت ہی سب سے نفع کی تجارت ہے۔ سوال از آسمان و جواب از ریسمان تو ملاحظہ ہو، کہنے لگا دوات کاغذ منگاؤ۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے اور اوس سے کہا کہ تم پھر وہی دوات کاغذ طلب کرتے ہو حالانکہ انھیں کی بدولت مجھپر وہ آفت نازل ہوچکی ہے کہ ابتک دل سُنسنا رہا ہے۔ اوس نے استعجاب سے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ مینے کہا کہ تمھارے حریف نصرانی نے سوئی کے ناکے سے باریک ایک نقطہ لگا کر کہا

کہ خدا کی طرح یہ بھی محض معقولی چیز ہے۔ یہ سنکر کندۂ ناتراشیدہ۔ کہنے لگا میں بالفعل تمکو نقطہ سے معاف رکھوں گا۔ لعنتِ خدا تو یری پر عجب بے تمیز ہے احمق نے نقطہ سے کیوں شروعات کی۔ اتنا تو حفظ مراتب کیا ہوتا کہ تم اُس درجہ پر کب پہنچتے تھے کہ نقطہ کو سمجھ سکو۔ مینے اپنے دل میں کہا کہ یک نشد دو شد یہ کم بخت تو مجھے گنوار جاہل فرض کیے لیتا ہے۔ خلیفہ کے دار الانشار کا تمام انتظام تو میری رائے پر محمول ہے اور یہ کہتا ہے کہ تم نقطہ کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اچھی طرح اسکی عقل کے ناخن لواؤں مگر حلم کہتا تھا کہ اِس بے ادب دریدہ دہن کی بات پر نہ جاؤ اپنے علم وفضل کی طرف دیکھو۔ میں پیچ وتاب ہی میں تھا کہ اوس نے اپنے غلام کو کچھ اشارہ کیا۔ غلام اُس بلا کا پھرتیلا اور چابکدست تھا کہ حکم کی دیر تھی فوراً ایک بدصورت۔ بدوضع بکس نما چیز لاکر حاضر کردی۔ چونکہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا اور کِس مصرف کی چیز ہے میں اوسپر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر نظر دوڑاتا تھا اور پھر سر نیچا کر کے دریائے تفکر میں غوطے لگاتا تھا۔ کہ آخر معلوم تو ہو یہ ہے کیا بلا۔ پہلے صندوق کا گمان پھر صندوقچہ کا دھوکہ ہوا آخر تابوت کا خیال آیا اور مینے اپنے دل کو یوں سمجھا لیا کہ ملحد کی لحد اور بے ایمان کی قبر ہے کہ لوگوں کو راہِ راست سے بہکا کر اس میں لا دھکیلتا ہے۔ اتنے میں اوس نے ایک بڑی موٹی لٹھ سلائی اپنی آستین سے نکالی۔ میں حیران کہ الٰہی یہ کیا معاملہ ہے کیا یہ شخص کوئی نیم طبیب خطرہ جان ہے۔ آخر نرہا گیا اور مینے اوس سے کہا تیری جو بات ہے عجیب ہے جو ادا ہے دنیا سے نرالی ہے ایسے سلائی تو مینے آج تک کسی طبیب کے پاس نہیں دیکھی۔ غالباً آنکھیں پھوڑنے میں کام آتی ہوگی۔

کہنے لگا میں طبیب نہیں ہوں بلکہ اِس کے ذریعے سے اشکال ہندسی اِس تکس پر کھینچتا ہوں۔ مینے کہا گو تو مذہب میں نصرانی کا مخالف ہے مگر کفر میں اوسکا شریک و موافق معلوم ہوتا ہے۔ کیا تیرا یہ مطلب ہے کہ روشنی روز کو تاریکی شب سے بدلدے اور مجھکو لوح محفوظ اور کراماً کاتبین سے انکار کی ترغیب دے کیا تو نے مجھے واقعی ایسا بے وقوف سمجھ لیا ہے کہ تیرے ہتکھنڈوں سے میرا پائے اعتقاد ڈگمگا جائے۔ اسپر کندۂ دوزخ کیا بکتا ہے کہ مجھے نہ لوح سے غرض نہ کسی کاتب کریم ولئیم سے، میرا کام تو اشکال ہندسی کھینچنا اور اون کو دلائل عقلی سے ثابت کرنا ہے۔ اتنا کہہ کر ادہر تو اوس نے لکھنے کا ارادہ کیا اودہر میری یہ کیفیت ہوئی کہ دل دہڑکنے لگا کہ خدا خیر ہی کرے۔ اوس میں اتنی سمجھ کہاں کہ شاگرد کی رغبت یا بے میلی کا خیال کرے۔ جھٹ ایک لکیر کھینچکر نہایت وثوق اور فخر کے ساتھ بولا کہ دیکھو خط لمبائی بغیر چوڑائی کا نام ہے جیسے یہ لکیر۔ یہ سنتے ہی صراط مستقیم میری آنکھوں میں پھر گئی اور جلکر اوس سے کہا کہ خدا تجھ سے سمجھے کم بخت سمجھتا بھی ہے یا یونہیں جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ کیا اِس لکیر کو صراط مستقیم بتا کر لوگوں کو راہِ راست سے بہکانا چاہتا ہے۔ صراط مستقیم کہاں اور یہ خط کہاں۔ صراط مستقیم تو تلوار کی دہار سے زیادہ تیز بال سے زیادہ باریک اور ہر ایک چیز سے جسکو تم ناپ سکتے ہو زیادہ لانبی ہے۔ کیا تجھے امید ہے کہ تیری لکیر کا فقیر ہو کر میں راہِ خدا سے منحرف ہو جاؤں گا یا تو نے مجھے ایسا سادہ لوح خیال کر لیا ہے کہ تیرے چکنے چپڑے لفظوں کا نقش میرے دل پر بیٹھ جائے گا۔ اور تیرے خبثِ باطن کی تہ کو نہ پہنچ سکوں گا۔ خدا کی قسم تو نے یہ لکیر کھینچکر اسکو طول بلا عرض صرف اس نیت سے بتایا ہے

کہ میرا قدم صراط مستقیم سے ہٹ جائے اور میں اوندھے موہنہ دوزخمیں
گر پڑوں۔ دانائے آشکار و نہان مجکو ہندسے سے اور نیز تمہارے تمام خیالات
سے خواہ تم اون کا زبان سے اعلان کرتے ہو یا دل میں پوشیدہ رکھتے ہو
اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اسپر بھی وہ بے شرم بند ہوا۔ اور پہر لوٹنا
چاہا تو اس خوف سے کہ کہیں پہلے گمراہ کی طرح یہ بھی شرک میں مبتلا ہو
مینے لوگوں سے کہا کہ خدا کے لیے اِس کے موہنہ پر ہاتھ رکھو یا یہاں سے
نکالدو۔ جب وہ مردود بارگاہ لم یزلی شیطان کی طرح مجلس سے نکال دیا
گیا تو مینے کاغذ کے ایک پرچہ پر اپنے ہاتھ سے لکھا کہ میں عہدِ واثق کرتا
ہوں اور وہ قسم کہاتا ہوں جسکا کوئی کفارہ نہیں کہ عمر بہر نہ کبھی ہندسہ کی
شکل دیکھوں گا نہ علانیہ یا خفیہ۔ اوس کے سیکھنے کا نام لوں گا اور اپنی اولاد
کو بھی زور کے ساتھ وصیت کرتا ہوں کہ قیامت تک نہ کبھی اوسکی طرف
موہنہ کریں نہ سیکھنے کا خیال کریں۔

اسیطرح صاحب ابن عباد کی نسبت جو موید الدولہ فخر الدولہ دیلمی کا وزیر
با تدبیر، خود بے مثل منشی و شاعر، اور تمام اہل کمال خصوصاً اہل سخن کا بے حد
قدردان و مربی تہا مشہور ہے کہ ہندسہ سے سخت جلتا تھا اور اہل ہندسہ پر
گاہ و بے گاہ تبرا کیا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ اِس گروہِ بے عقل
میں سے ایک بے شعور نے یہہ حرکت کی کہ مجھکو ہندسہ کا شوق دلانے
کے لیئے چھبیس کے عدد کو ثابت کرنے اور کچھ لکیریں اور شکلیں کاڑھ کر اپنے
زعمِ باطل میں اوسپر دلیلیں قایم کرنے لگا۔ مینے کہا حضرت جس چیز کو آپ
اس قدر زحمت گوارا کرکے ثابت کرنا چاہتے ہیں اوس سے تو میں
بغیر دماغ کو تکلیف دیئے یونہیں بخوبی واقف تھا۔ آپنے یہ کیڑے مکوڑے

کاڑھنے کی تکلیف ناحق اوٹھائی۔ آپ کا ہندسہ بھی واللہ عجیب چیز ہے کہ عمر بھر کی جانی پہچانی چیزوں کو گورکھ دھندا بنا دیتا ہے۔ یہ علم کاہے کو ہوا جان کا جنجال سمجھ کا وبال ہوا۔ کس کی شامت آئی ہے کہ بیٹھے بٹھائے مفت خدا درد سر مول لے ✤

ناظرین سے اُمید ہے کہ اِس مضمون کو پڑھتے وقت ابن ثوابہ کے زمانہ کے لوگوں کے مذاق اور خاصکر اون کے مذہبی جوش کا لحاظ رکھیں گے۔ کیونکہ بغیر اس کے چنداں لطف نہ آئے گا۔ اور لطیفوں کی باریکیوں پر شاید نظر نہ پہنچے گی ✤

فدا علیخاں رامپوری

## غزل

مری ناکامئ جاوید تیرا مدعا کیوں ہو — تری امید کا آزار دردِ لا دوا کیوں ہو

وہ دل جس سے ابھی دونوں جہاں کے کام لینے ہیں — تری موہوم سی امید پر صرفِ وفا کیوں ہو

مری تقدیر بھی تیری طرح کیوں مجھسے پھر جائے — بھلا بیفائدہ ہر ساز تیرا ہم نوا کیوں ہو

کسی کلفت زدہ کا دل دکھا کر کیا بھلا ہوگا — تری پاکیزہ عادت کا یہی اک مقتضا کیوں ہو

مجھے یہ ضد کہ "تجھسے خستگی کی داد چاہوں گا" — تجھے یہ ہٹ کہ "اک برگشتہ قسمت کا بھلا کیوں ہو"

تجھے مجھپر خدا ناخواستہ کیوں رحم آجاتا — ترے دل میں نصیبِ دشمناں خوفِ خدا کیوں ہو

مری تقدیر ہی میری ڈبو دینے کو کافی ہے — میری ٹوٹی سی کشتی کیلئے طوفاں بپا کیوں ہو

مرے کلفت زدہ دلکو بہانہ ہاتھ آتا ہے — مرے آگے گذشتہ صحبتوں کا تذکرہ کیوں ہو

ترا آزاد پابندِ علایق ہو نہیں سکتا — وہ آزادی کا عاشق ہے گرفتارِ بلا کیوں ہو

(آزاد سہارنپوری)

# سفرنامۂ سویڈن و روس

صبح کا سہانا وقت تھا اور فرحت بخش ہوا خلیج مالیر کی سطح پر چل رہی تھی موسم ایسا خوشگوار اور دلفریب تھا کہ اُس سے روح کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ۶ بجتے ہی ہمارا جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ کیونکہ روانگی کے لیے یہی وقت مقرر کیا گیا تھا۔

سٹاکھوم کا خوبصورت شہر اپنے سفید سفید مکانات اور اپنے خوش وضع شاہی محل کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک حسین و شکیل دوشیزہ سطح آب پر شاداں و خنداں کھڑی ہوئی ہے۔ ہمیں اس شہر کی جدائی کا سخت افسوس تھا کیونکہ ہم نے یہاں کے نیکدل باشندوں میں رہکر بہت لطف اُٹھائے اور یہاں کے اُن تمام جلسوں میں جو ولیعہد کی شادی کی تقریب میں منعقد ہوئے شریک تھے اور وفاشعار رعایا نے جن جن طریقوں سے اپنے نیک بخت بادشاہ اور ہر دلعزیز ولیعہد کے ساتھ وفاداری کے ثبوت دیئے تھے اُنہیں ہم نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ہمارے راستے کے بائیں جانب ہرنوں کی شکارگاہ تھی جسکا نظارہ بڑے بڑے درختوں اور خوبصورت مکانات کے سبب سے بہت دلفریب تھا۔ یہہ بیکار اور شایقینِ تفریح لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ داہنی طرف بنجر چٹانیں تھیں جن سے وحشت برستی تھی۔ البتہ اُنپر کہیں کہیں صنوبر کے سیاہی مایل درخت اُگے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ پتھروں کی وجہ سے اُن کی نشو و نما کے سامان مفقود تھے۔ اسوجہ سے یہہ درخت سرسبز اور

بلند نہ تھے۔ جہاز کے راستہ میں کئی میل تک طرح طرح کے منظر ہمارے پیش نظر رہے۔ اُن کی ظاہری حالت گو تغیر پذیر تھی۔ مگر اُن کی خوبصورتی مستقل تھی۔ آخر کار ہم ویگز ہوم پہونچے۔ یہ جزیرہ فوجی طاقت کے لحاظ سے بہت مضبوط ہے اور مملکت سویڈن کا پہلا جنگی مقام ہے۔ یہ روس کے راستہ میں بنایا گیا ہے۔ یہاں کی توپوں کی ٹھیک زد پر زار روس کا ایک جنگی جہاز کھڑا ہوا تھا۔ اس مقام سے اُس نہر کی حفاظت کی جاتی ہے جسمیں بڑے بڑے جہاز بھی چل سکتے ہیں اور یہ مقام قدرتی طور پر بھی بہت مضبوط واقع ہُوا ہے۔

سویبرگ ہاتھ سے گیا۔ یہی حال آلینڈ کا ہوا۔ ویگز ہوم پر بھی جو ابھی تک سویڈن کا جایز مقبوضہ سمجھا جاتا ہے اُس کے دانت ہیں۔ لیکن اسوقت تک یہ سنتری (ویگز ہوم سے مراد ہے) آزادی کے پھاٹک پر پہرا دے رہا ہے اور اسکو ظالمانہ دست درازی سے بچانے پر آمادہ ہے اور اسبارہ میں وہ دوست دشمن دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔

بحر بالٹک میں داخل ہونے کے بعد ہمکو بیشمار چھوٹے چھوٹے جزیروں میں سے ہو کر گذرنا پڑا اُن میں سے بعض ایسے تھے کہ اُن کا تھوڑا ہی سا حصہ سطح سمندر سے اونچا تھا۔ البتہ بعض بعض میں اونچے اونچے پہاڑ کے ٹیکرے بھی نظر آئے اور ماہی گیروں کی کشتیاں بھی بکثرت دکھائی دیں جو کبھی نگاہ میں رہتیں اور کبھی غائب ہو جاتیں۔ یہ بات بھی غنیمت تھی کہ اِن دلچسپ مناظر کی وجہ سے ہماری طبیعت بہل گئی ورنہ ہمارا خراب خستہ مختصر جہاز اسقدر سست چلتا تھا کہ مجمع الجزائر آلینڈ تک پہونچتے پہونچتے آدھی رات ہو گئی۔

اِس جگہ ہمیں ٹھہرنا پڑا کیونکہ یہاں سے جہاز کو لکڑیاں لینی تھیں۔

یہ جزایر جو ۱۸۰۹ء میں روس کو تفویض کیئے گئے تھے ضلع آبو کا ایک حصہ ہیں۔ یہ خلیج بوتھینا میں واقع ہیں، اور یہ ایک ایسا موقع ہے کہ جسکی وجہ سے مملکت سویڈن پر پورا دباؤ پڑ سکتا ہے اور سویڈن اور روس کے مابین جنگ چھڑ جانے کے وقت یہاں جنگی جہازات کے بیڑے رکھے جا سکتے ہیں جو اول الذکر کے حق میں بہر طور ایک خطرناک امر ثابت ہوگا۔

صُبح کے چھ بجے سے پہلے ہمارا جہاز روانہ نہو سکا۔ اسوقت تک عجب کشمکش جہاز پر رہی۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی تختۂ جہاز پر جمع تھے اور ہر ایک شخص لکڑی کے سڈول تختہ کی تلاش میں تھا۔ جسپر لیٹ کر رات بسر کرے۔ جہاز پر لکڑیوں کے انبار اسقدر اونچے اونچے تھے کہ ہوا اُن سے ٹکرا کر جہاز کو ڈگمگا دیتی تھی اور بعض اوقات تو جہاز کے بالکل تہ وبالا ہو جانے کا خیال ہوتا تھا۔ اب ہمارا جہاز رودِ آؤرا میں داخل ہوا۔ اِسی ندی پر فنلینڈ کا قدیم دارالسلطنت آبو واقع ہے۔

ہمارے بائیں جانب پُرانے محل کے مینار نظر آتے تھے جو اپنی قد و قامت کے لحاظ سے اگرچہ قابل عزت ضرور تھے لیکن اُن کی ظاہری حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ تاہم اِس محل میں ایک خاص قسم کی دلچسپی تھی جسکو اس کی صنعتی خوبیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بجائے خود زمانۂ قدیم کی ایک مقدس یادگار ہے اور از روئے تاریخ اسکا تعلق بہت سے دلچسپ واقعات سے ہے۔ یہاں ایرک نے جو گستاوس واسا کا ایک ناخلف فرزند تھا اپنے بھائی کو قید کیا اور ہر قسم کے ظالمانہ

کام کرنے کے بعد خود بھی یہیں مقید ہوا۔ زمانۂ قدیم میں اسکو فنلینڈ کا قلعہ خیال کرتے تھے۔ کئی دفعہ یہ روسی حملہ کے لیئے سدراہ بنا اور بعض اوقات اِس کے ذریعے اُن سیاسی جماعتوں کا مقابلہ کیا گیا جو تیرہویں اور سولھویں صدی کے مابین حکومت کے لیئے جنگ و جدال کرتی تہیں۔

آؤرا ایک غیر معروف ندی ہے اُس کے دہانہ سے دو میل کے فاصلہ پر شہر آبو واقع ہے جس ہی کہ ہم بندرگاہ میں داخل ہوئے محکمۂ چنگی کے چند افسر جو صورت سے نہایت سیدھے سادے معلوم ہوتے تھے جہاز پر آئے۔ ہم نے پروانۂ راہداری جو کپتان سے پہلے ہی لے لیئے تھے اُن کو دیدیئے۔ جس سلسلے سے ہمارے نام فہرست میں درج تہے اُسی کے مطابق نمبروار معائنہ کیا گیا۔ اور اسباب کی نہایت سخت دیکھ بھال کے بعد ہمکو خشکی پر آنے کی اجازت ملی +

دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سینٹ پٹرز برگ کو جو سٹیمر جانے والا تھا وہ صبحکو روانہ ہو چکا اور جس جہاز پر کہ ہم آئے تہے وہ ایک ہوٹل والے کا تھا جس نے اپنے فایدے کے لیے نہایت ہوشیاری سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ موخر الذکر جہاز اول الذکر کی روانگی کے بعد آبو پہونچا کرے اور اس طرح اُسے ہر ہفتہ ایک کثیر تعداد مسافروں کی رُوک لینے کا موقع ملتا جو کئی دن تک اُس کے "سوسائٹی ہوس ہوٹل" میں ٹھیرا کرتے۔ اِس تعویق میں ہمارے لیئے صرف یہی امر اطمینان بخش تھا کہ ہوٹل کا انتظام عمدہ اور باقاعدہ تھا۔

دوسرے دن ہمکو صاحب ضلع کے پاس جانا پڑا۔ اور اوس نے ہمیں سینٹ پٹرز برگ تک کا پروانۂ راہداری دیا۔ لیکن اسپر ابھی

پولیس کی تصدیق ضروری تھی جس کے بغیر یہہ کسی کام کا نہ تھا - اِس کے لیئے ہمیں کچھ فیس بھی دینی پڑی -

آبو فنلینڈ کا قدیم ترین شہر ہے اور اِس ملک میں مذہب عیسوی کا یہی گہوارا تھا - لیکن اُس کے زمانۂ ترقی و عروج کی یادگاریں اب بہت کم ہیں - یہہ بہت سی مصیبتوں کا آماجگاہ بنا رہا - اِن سب پر طرہ وہ آتشزدگی تھی جو ۱۸۲۷ء میں وقوع پذیر ہوئی - ہلسنگفورس حالئیکو دار الحکومت بنایا گیا ہے اور سلطنت روس نے اپنی حکمت عملی سے یونیورسٹی کو بھی وہیں اُٹھوا دیا ہے تاکہ لوگوں کو جو رہا سہا تعلق اپنے مذہب کے مولد اور اپنے دار العلم سے تھا باقی نہ رہ جائے - اور جو جو امداد اُس شہر کو ملتی تھیں وہ سب موقوف کر دی گئیں اور آخر نتیجہ یہہ ہُوا کہ وہاں کی تجارت کو جو اَب کچھ دنوں سے بہرُو بہ ترقی ہے نقصان پہنچنے لگا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ تقریبًا بالکل مٹ گئی -

یہاں کا قدیم گرجا اُسی آتشزدگی کی نذر ہُوا جس کی وجہ سے اُسکا اندرونی حصہ تمام جل گیا اور بہت سی یادگاریں جو اُس کے اندر بنی ہوئی تھیں برباد ہو گئیں - یہہ گرجا جو شاہان گاتھ کے عہد کی ایک قدیم عمارت ہے اب بھی موجود ہے اور اُسکی مرمت بھی کسیقدر ہو گئی ہے - اُسیکے قریب خوشوضع گریک چرچ کھڑا ہوا پُرانے گرجا کو جو بجائے خود بہت باعظمت ہے مُنہ چڑھا رہا ہے گویا کہ ایک تُنک ظرف لڑکی کسی مہذب اور با مذاق بوڑہی عورت کو جو اُس سے زیادہ شریف اور شوقین ہے اپنا حُسن و جمال دکھا رہی ہے -

ہم اِس گرجا میں داخل ہُوئے اور چاروں طرف کی چیزوں کو

اور اُن لوگوں کی یادگاروں کو جنکی قسمت میں جلد مٹ جانا اور صفحہ ہستی سے محو ہو جانا بدا تھا بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے منجملہ اُن کے ہم نے ایک سنگی لوح دیکھی جو کیتھراین مارس کی یادگار میں وہاں نصب تھی کیتھراین ایک کاشتکار کی لڑکی تھی اُس کا حُسنِ صورت بہت دلکش و دلفریب تھا ایرک چہاردہم اُسے زبردستی اُس کے مکان سے نکال لے گیا اور اپنے ساتھ اسکو غیر معمولی شان و شوکت سے تخت نشین کیا۔ لیکن ظالم شوہر کے زوال کے بعد وہ بالکل مفلس رہگئی اور نہایت ہی قابل رحم حالت میں اُسکا انتقال ہو گیا۔

نیچے کے تہ خانوں میں فنلینڈ کے شریف اور فرزانہ لوگوں کی نعشیں دفن تھیں جو یکساں ابتری کی حالت میں صندوق سے نکلی ہوئی ادہر اُدہر پڑی تھیں۔ مشہور لوگوں کی لاشیں البتہ نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھیں تاکہ اجنبی لوگ بآسانی دیکھہ سکیں۔ منجملہ اُن کے ایک لاش کسی فلاسفر کی تھی۔ کاسہ سر کی جسامت اور وضع سے اُس شخص کی عالی دماغی۔ اور غیر معمولی ذہنی قابلیت ظاہر ہوتی تھی۔

ہمارے راہبر نے تمسخر اور شوخی کے ساتھ ہم سے کہا کہ ذرا نیچے اُتر کر دیکھئے کہ پروفیسر صاحب کس شان سے دکھائی دیتے ہیں"۔ آہ! یہ اُس شخص کی ہڈیاں پڑی تھیں جسکا اثر غالباً اُس کی زندگی میں گرد و پیش ساری عمر رہا ہوگا اور جسکو بزمانۂ حیات اپنے ہموطنوں میں ہر دلعزیزی حاصل ہوگی اور جسکی موت پر سبھوں نے اشک تاسف بہائے ہونگے۔ لیکن اب اُسی کے ساتھ خوش طبعی کیجاتی ہے اور وہ گنواروں کی تشنیع و طعن کا ہدف بن رہا ہے۔

سید محمد فاروقی

## اور

## نظم قصۂ گل بکاولی فارسی زبان میں

رسالہ "مخزن" کے ناظرین نے اوس کے پچھلے صفحوں میں "ریحان حسین خان متخلص بہ ریحان" لکھنوی کی مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائے ہونگے جسکا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے۔ وہ ۱۲۱۷ھ میں کہی گئی تھی۔ اوس کا رنگِ سخن وہی ہے جو "گلزار نسیم" کا ہے اور بحر بھی وہی ہے۔

"مخزن" میں اگرچہ جرح اور تعدیل نہیں کی گئی لیکن دونوں مثنویوں کے ہم رنگ اور ہم مطلب اشعار برابر برابر لکھ دیے گئے ہیں تاکہ نگاہیں خود موازنہ کرلیں۔

"گلزار نسیم" کا تاریخی مصرع "توقیع قبول روز بخشش باد" خود اوس کے مصنف کا طبع زاد ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۵۴ھ میں کہی گئی تھی گویا "باغ و بہار" "گلزار نسیم" سے ۳۷ برس پیشتر تصنیف ہوئی تھی۔

دونوں کو دیکھکر یہ اندازہ کیا گیا کہ "گلزار نسیم" میں اختصار اور فصاحت زیادہ ہے۔ ۳۷ برس قبل اور بعد کی زبانوں میں فرق ہونا بھی چاہیے تھا خصوصًا ایسی حالت میں جبکہ ناسخ مرحوم زبان کی اصلاح پر ہر پہلو سے متوجہ ہوگئے تھے۔

یہہ وجہ بھی قابل تسلیم ہے کہ نقش اول کے بعد نقش ثانی میں کچھ نہ کچھ

خوبیاں بڑھ ہی جاتی ہیں اگر "نسیم" نے بہ نسبت "ریحان" کے خوبیاں بڑھادیں تو لطف سخن سنجی ایسی ترقی کا مقتضی بھی تھا۔

مجھے اسوقت جو کچھ لکھنا ہے یہ "باغ و بہار" سے علٰحدہ ایک اور ہی بات ہے اور جس کے سبب سے یہ فیصلہ مشکل ہو گیا ہے کہ آیا "گلزار نسیم" نقش ثانی ہے یا نقش ثالث۔

میرے سامنے فارسی زبان میں نظم قصہ گل بکاولی کا رکھا ہوا ہے۔ اسکی بحر بھی وہی ہے جو "باغ و بہار" اور "گلزار نسیم" کی ہے۔ اور رنگ سخن بھی ملتا جلتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بہت اوراق اول کے اور بہت آخر کے غائب ہیں۔ پتا نہیں ملتا کہ یہ کس سنہ میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس کے مصنف "رفعت لکھنوی" ہیں جنکو میں نہیں جانتا۔ تخلص اس نظم میں بہ کثرت موجود ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے یہ فارسی کی مثنوی تصنیف کی گئی تھی یا گلزار نسیم البتہ فارسی کی مثنوی میں دو شعر ایسے ہیں جن سے یقین تو نہیں لیکن گمان ہو سکتا ہے کہ "گلزار نسیم" سے بیشتر کہی گئی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔

وہ اشعار یہ ہیں۔

یعنی چو کہن بشد زمانہ　　کم قدر شدہ است ایں فسانہ

خواہم کہ بگویمش دگر بار　　یارب بکشا لبم بہ گفتار

"دگر بار" کے الفاظ سے یہ مطلب نکالنا قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ "گلزار نسیم" اوسوقت تصنیف اور شہرت کے دائرے میں نہیں آئی تھی۔

"کم قدر" کے الفاظ کا اطلاق بھی "گلزار نسیم" پر نہیں ہو سکتا جسکی قدر اور جس کے سبب سے قصے کی قدر تصنیف کے زمانے سے آجتک

ایک سی حالت میں ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ "رفعت" نے کم قدر ہونے کا حرف گل بکاولی کے پرانے قصے پر رکھا ہے۔ اسکو تسلیم کر لو تو پھر یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ "گلزار نسیم" اوس وقت موجود نہیں تھی اور یہ کہ "رفعت" کی فارسی مثنوی "گلزار نسیم" سے مقدم ہے۔

ہم کو بغیر کسی قطعی دلیل کے صرف قیاس کی بنا پر یہ کہنا کہ "رفعت ہی مقدم تھے اور "نسیم" ضرور موخر ہیں۔ زیبا نہیں ہے۔ لیکن ہمارے فہم کو اس بات کے سمجھنے میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہے کہ ایک مثنوی کی تصنیف کے وقت دوسری زیر نگاہ یا پیش دماغ ضرور تھی۔ اس لیے کہ بعض اشعار۔ اور اکثر مصرعے دونوں مثنویوں میں اس قدر ہم رنگ یا ہم الفاظ ہیں جنکو دیکھکر بےساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں سخن سنجوں میں سے ایک مصنف اور دوسرا مترجم ہے۔ اکثر مثالیں بھی ایسی ہیں جو زبان کا بھیس بدلے ہوئے دونوں مثنویوں میں موجود ہیں لیکن شکل ایک ہی ہے۔

جو فرق طوالت اور اختصار کا "باغ و بہار" اور "گلزار نسیم" میں ہے۔ وہی اس فارسی کی مثنوی اور گلزار نسیم میں بھی ہے۔ یہ صورت بھی کچھ پتا دیتی ہے کہ عجب نہیں۔ گلزار نسیم ہی موخر ہو۔ اسلئے کہ "باغ و بہار" اور "رفعت" کی مثنوی دونوں کے پھولوں کا کھنچا ہوا جوہر "گلزار نسیم" کے رنگ میں پایا جاتا ہے +

اب ہم "رفعت" اور "نسیم" کے رنگوں کی یکرنگی مختصراً دکھاتے ہیں تاکہ ارباب نظر خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک نظم کو دوسری نظم سے کہانتک تعلق ہے +

رفعت ۔ باعیسے حشیم یک نظر بود

نسیم۔ عیلسے کی تہیں اوس نے آنکھیں دیکھیں

شاید فارسی مصرع میں کاتب کی قلم سے کسی لفظ کا تغیر و تبدل ہو گیا ہے اسلیئے کہ ترکیب اسکی صاف معنی نہیں پیدا کرتی - مگر یہ مطلب بہر صورت حاصل ہے کہ فارسی اور اُردو کی دونوں نظموں میں دونوں مصرعوں کا ماخذ ایک ہی دماغ ہے۔

رفعت۔ چوں مردمکش نگاہ دارید۔

---

نسیم۔ پتلی سا نگاہ رکھہ کے پالا۔

---

رفعت۔ عازم بہ سفر شدند ہر چار
زیشاں بہ بریدشاہ ناچار

نسیم۔ شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
رخصت کیئے شاہ نے چار ناچار

---

رفعت۔ گفتند کہ چشم شاہ شد کور
تا چید ز عارض پسر نور

---

نسیم۔ سلطان زین الملوک شہ زور
دیدار پسر سے ہو گیا کور

---

رفعت — بارے چو رخش ترا نماید
بینائی چشم تو ربايد

---

نسیم — پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسکو
پھر دیکھ نہ سکیگا کسیکو

---

رفعت — مے گشت چو گرد رہ بدشتے

---

نسیم — میدان میں خاک اُڑا رہا تھا

---

رفعت — در مشت تو باد را چہ پیما

---

نسیم — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

---

رفعت — در دیدہ کنم چو مردمک جا

---

نسیم — ہے چشم پری میں جائے مردم

---

رفعت — چوں سرو بہ ہر طرف خراماں

---

نسیم — شمشاد رواں ہوا چمن میں

رفعت۔ از بہر تو اے بتِ پری رُخ
مشہور شدم بنام فرخ

~~~~~~

نسیم۔ فرخ ترے واسطے ہوئی میں

~~~~~~

رفعت۔ حالت بہ زبان تو شنیدم

~~~~~~

نسیم۔ سب تجھ سے سنی تری زبانی

~~~~~~

رفعت۔ ہیہات کہ رو نہفتی از من

~~~~~~

نسیم۔ تو نے کیوں آکے منہ چھپایا

~~~~~~

رفعت۔ اے دلبر دلبر زیاں کار

~~~~~~

نسیم۔ اے دلبر دلبر دغل باز

~~~~~~

رفعت۔ اے شاہِ ارم بتِ گل اندام
فرخ لقب و بکاولی نام

~~~~~~

نسیم۔ اے شاہِ ارم کی دخت گلفام
~~~~~~

فرخ لقب و بکاولی نام

رفعت۔ باز آمدہ آب رفتہ در جو

نسیم۔ آیا پھر آب رفتہ جو میں

رفعت۔ ہمچوں درِ توبہ در کشادہ

نسیم۔ توبہ کا سا در کھلا ہوا تھا

رفعت۔ در جامۂ خویشتن نہ گنجید

نسیم۔ پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

مینے یونہی اوراق کو الٹ پلٹ کے سرسری نگاہ سے انتخاب کر دیا جو دونوں نظموں کا موازنہ کرنے کے لیئے غالباً کافی ہو۔ اگر کوئی غور اور تامل کے ساتھ دیکھے تو کثرت سے اِن دونوں مثنویوں کے اشعار باہم دست و بغل ملیں گے۔

اب میں رفعت کی مسلسل نظم مختصر طور پر دکھاتا ہوں کہ رنگِ کلام کے اتحاد کا اور بھی عقدہ کھل جائے۔

## بکاولی کا خط تاج الملوک کے نام

اے یار جفا شعار عیار — اے دلبر دلبر زیاں کار
اے دشتِ نوردِ درد و محنت — اے رہروِ منزلِ محبت
اے نقب زنے بہ کوے جاناں — اے حاصلِ آرزوے جاناں
اے داغ نہِ بہ سرینِ حاسد — اے مہر نما بہ کینِ حاسد
اے یوسفِ مصرِ حسن و اقبال — اے رشکِ برادرانِ بدفال
اے دیو سوار و مونسِ دیو — اے پُرفن و حیلہ ساز و پُرریو
اے نقدِ دل دو کون در کف — چوں دزد و حنا چراغ بر کف
بردی بہ فریب گل ز باغم — کردی ہمہ تن چو لالہ داغم
بودم ز مےِ شبیں سحر مست — انگشترِ من بہ بردی از دست
دیدی بدنِ نہفتہ عریاں — در چشم تو بس شدم پشیماں
از بہر تو اے بتِ پری رخ — مشہور شدم بہ نام فرخ
در خلوتِ خاص تو رسیدم — حالت بہ زبانِ تو شنیدم
چون دامنِ گل تنت کنم چاک — چوں بار بہ حیثیت افگنم خاک
زود آے و بہ پہلوم بیاسائی — سے سائے سرِ نیاز بر پائے

## تاج الملوک کا خط بکاولی کے نام۔

اے غادۂ ارم بتِ گل اندام — فرخ لقب و بکاولی نام
اے راہ نورد بے وفائی — اے گم کنِ راہ آشنائی
زلف تو نے رود گہہ از یاد — زنجیر بہ پاے جانم افتاد
ہیہات کہ رو نہفتی از من — راز دل خود نہ گفتی از من
اکنوں طلبی مرا بسوے خویش — پاشی چہ نمک تو بر دل ریش

آن ہمت عالیم کنوں نیست — این شوق مرا بجز جنوں نیست
حالہ مرا چو شد مدد گار — از یاری او برآمد این کار
گر مے طلبی مرا در آن جا — بفرست بہ رہبری کسے را

تاج الملوک اور بکاولی کی گفتگو

پس گفت چگونہ گل ربودی — گفتا کہ چہ خوش بہ خواب بودی
گفتا گل من فسردہ چون شد — گفتا دل من چگونہ خون شد
گفتا کہ چہ بہ ناز مغرور — گفتا کہ ترا چہ ہست منظور

جمیلہ کا تاج الملوک اور بکاولی کو ایک جگہ دیکھنا

در باغ گل دگر شگفتہ — دختر بہ کنار غیر خفتہ
بر گنج نہاں نشستہ مارے — در دامن گل خلیدہ خارے
زد بانگ براد جمیلہ کیں چیست — این فتنہ خفتہ دلبر کیست
این کیست کہ در بر تو خفت است — اے طاق بہ خفتہ این کہ جفت است

ایک بات اور بھی میرے خیال میں آئی جس سے یہہ خیال ہوتا ہے کہ "رفعت" کی نظم مقدم ہے۔ یعنے اِس فارسی کی مثنوی میں اصل قصے کو بھی بہ نسبت گلزار نسیم کے طوالت ہے یسنیم نے شاید خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا۔ طویل کو انتخاب سے مختصر کر دینا یہہ ایک قیاسی دلیل اس امر کی ہوسکتی ہے کہ "گلزار نسیم" موخر اور منتخب سمجھی جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا اِس لیئے کہ "نسیم" نے ہر مطول کو مختصر کیا ہے

احمد علی۔ شوق۔ قدوائی۔

# میل جول

انسان کے آپسمیں میل جول پر ایک کتاب مختلف پہلوؤں سے لکھی جاسکتی ہے۔ منجملہ اِن پہلوؤں کے ایک پہلو سائینٹفک پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ جسمیں یہ خصوصیت ہے کہ ان قدرتی قوانین کی زیادہ توضیح ممکن ہے۔ جنکی پابندی انسانی میل جول میں ہونی چاہیئے اگر ہمیں بخیتہ طور پر معلوم ہوتا کہ وہ قوانین کیا ہیں تو ہم بآسانی اِس امر کی پیشین گوئی کرسکتے کہ اِس مزاج کے آدمی آپسمیں راہ و رسم خوشی سے رکھیں گے اور اِس طبیعت کے ایک دوسرے سے علیحدہ رکھیں گے۔ اِس صورت میں انسانی میل جول ایسا ہی یقینی سائنس ہوتا جیسا کیمسٹری جسمیں ہم نہایت وثوق اور درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ اِن اشیا کو یکجا کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوگا۔ بعض حالتوں میں اِس سائینٹفک حد کے قریب پہنچنا ممکن بھی ہے۔ مثلاً جب ہم دو آدمیوں کی خصوصیت سے بخوبی واقف ہوں تو ہم کسی حد تک درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ اون کی آپسمیں نہ نبھیگی +

بعض دوربین اشخاص افراد کے باہمی میل جول کے متعلق بہت صحت کے ساتھ رائے زنی کرسکتے ہیں۔ مگر بس یہیں انکی دانائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ اِن مختلف مثالوں سے کوئی عام قاعدہ یا قانون نہیں بنا سکتے جن پر دیگر قوانین قدرت کی طرح عملدرآمد کیا جاسکے۔ اِس لیئے اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اِس قسم کے

قانون قوانین قدرت میں سے نہیں بلکہ ان کی ایک ناقابل اعتبار اور بھدی نقل ہیں +

اِس مشکل کے پیش آنے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی طبائع بے حد مختلف واقع ہوئی ہیں اور اسی اختلاف کا باعث ہے کہ جس آدمی کو ہم پہلے سے نہیں جانتے اور جسکی عادات واطوار کے مطالعہ کا ہمیں موقعہ نہیں ملا تو اسکی نسبت ہم اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اسلئے اِن لوگوں کی نسبت جن کے حالات سے ہمیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہم کس قدر غلط رائے قائم کر سکتے ہیں اور یہ دریافت کرنا ہمارے لیے کس قدر مشکل ہے کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو اپنا دوست بنائیں گے

انسانی میل جول کے متعلق بعض خیالات جو عوام میں مشہور ہیں خالی از دلچسپی نہیں مثلاً عام طور پر مانا جاتا ہے کہ بے تکلف دوست ہونے کے لیئے دونوں کو ایک ہی فرقے اور قریب قریب ایک ہی حیثیت کا ہونا چاہیئے۔ مگر جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی مثالیں اِس کے بالکل برعکس نظر آتی ہیں۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ آپسمیں میل جول بڑھانے کی وجہ ایک خاص بات میں دونو اشخاص کا دلچسپی لینا ہوا کرتی ہے۔ میرے خیال میں بہت سی مثالیں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک ہی بات میں دلچسپی لینا دوستی کا باعث ہونے کے بجائے موجب فساد ہوا ہے۔ البتہ اسوقت تک نبھتی رہتی ہے جب تک طرفین میں سے ایک کسی قدر لاپرواہی برتتے۔ جتنی زیادہ دلچسپی ایک بات میں ہوگی اِسی نسبت سے اِس کے متعلق فروعی چیزیں بھی ہماری

نظر میں ضروریات سے بڑھکر ہونگی مثلاً دو شخص مذہب کے بے حد دلدادہ ہیں مگر انمیں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا عیسائی تو اس حالت میں انکا باہمی میل جول باوجود ایک ہی بات میں دلچسپی لینے کے ناممکن ہے۔ حالانکہ اگر وہ مذہب کے معاملہ میں لاپروا ہوتے تو انکا میل جول دوستی کی حد تک پہنچ سکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قومیت کا فرق باہمی میل جول کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ مگر نہیں واقعات اس کی تردید کرتے ہیں اسمیں شک نہیں کہ قدرتی طور پر ایک قسم کا تعصب ہمارے دلمیں غیر قوم کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور ہمارا یہہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری ایک اجنبی شخص کے ساتھہ نہیں بن سکتی۔ مگر جب یہ غلط خیال رفع ہو جائے تو اجنبیت وغیرہ سب جاتی رہتی ہے اور اتحاد قایم ہو جاتا ہے۔ البتہ زبان کا اختلاف ضرور سدراہ ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور سے صاف ظاہر ہے کہ باہمی میل جول کے لیے کوئی کلیہ قاعدہ قرار دینا کسقدر مشکل ہے۔ نہ ہم فرقہ ہی ہونا آدمیوں کو ایک دوسرے کی طرف راغب کرتا ہے نہ ایک نسل کا ہی ہونا اور نہ کسی ایک خاص بات میں دونوں کا دلچسپی ہی رکھنا البتہ اگر کوئی کلیہ قاعدہ بنایا جاسکتا ہے تو میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ دو آدمیوں کی شخصی خصوصیات میں یگانگت اِن کے زیادہ ربط وضبط کا باعث ہوتی ہے یہ شخصی یا ذاتی خصوصیت کیا چیز ہے میں نہیں جانتا اور نہ مجھے کسی ایسے دانا آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے اِس کے متعلق

بھے آگاہ کیا ہو۔ یہ شخصی خصوصیت ایک معمہ ہے اور اس کی پیچیدگی ہم پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم اپنے دوستوں میں سے ایک خاص دوست کی طرف زیادہ مائل ہونے کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کر سکتے +

مینے کئی دفعہ اِس بات کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے دوستوں میں سے ایک خاص دوست کی صحبت میں زیادہ لطف کیوں آتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اسے اوروں سے ممتاز کردے۔ میری اسکی عادات بھی کچھ ملتی جلتی نہیں۔ اِس کے عیب بھی مجھسے پوشیدہ نہیں۔ پھر ہے تو کیا وجہ ہے معلوم ہوا کہ اوروں میں وہ خاص بات نہیں جو میل جول کو دلچسپ بنائے یہ خاص بات کیا ہے میں نہیں بتا سکتا +

مذاق کی موافقت ایک ایسا فقرہ ہے جو میرا مطلب کسی حد تک ظاہر کرتا ہے۔ مگر اسپر وضاحت سے لکھنا اِس لیئے مشکل ہے کہ انسانی طبائع کے اختلاف کا آجتک کسی کو پتہ نہیں چلا

مذاق کی یگانگت یا ناموافقت دو ایسی طاقتیں ہیں جو باہمی میل جول کو ممکن یا ناممکن بتاتی ہیں مگر ان کی وجوہ ایسی پیچیدہ پہیلیاں ہیں کہ جنہیں بوجھنے کے لیئے بڑے بڑے بوجھ بجھکڑ سر دھنتے ہیں۔ فقط

محمد عبدالرحمن۔ بی۔ اے۔

# مذہب کیا ہے

## گذشتہ اشاعت سے آگے

ڈاکٹر جان کیرڈ سابق پرنسپل و وائیس چانسلر گلاسگو یونیورسٹی مذہب کی توضیح جس میں انہوں نے مذکورۂ صدر خیالات کو ظاہر کیا ہے اس طرح کرتے ہیں۔ مذہب یہ ہے۔ کہ محدود ارادت کی مشیت غیر محدود کے تابع کیا جائے۔ ہر خواہش۔ ہر تمنا اور ہر آرزو کو جو بہ حیثیت انسان مجھ میں پائی جاتی ہے۔ اِس سے انحراف کروں اور ہر مقصد اور غرض سے جو خاص میری خوشی اور فائدہ سے متعلق ہے۔ اجتناب کروں یعنے میں اپنی مرضی کو بالکل خدا کی ارادت کے تابع کر دوں اور اپنے تئیں اُس پر چھوڑ دوں[1]" اگر مذہب کی غائت اپنی شخصی مرضی کو خدا کی مرضی کے بالکل تابع کرنا ہے تو احتیاج یہی ہے کہ ہم اپنی خوشی سے اپنی مرضی کو خدا کی ارادت کے سپرد کر دیں۔ کیونکہ اِس سے انسانی اور الٰہی مرضیوں کے درمیان ایک قسم کی قرابت اور وصل واقع ہو جاتا ہے محدود اپنے تئیں غیر محدود میں پاتا ہے۔ اور آخر الذکر مقدم الذکر کے وسیلہ سے ظہور پاتا ہے۔ اور دونوں میں ربط ضبط۔ اور میل جول اخلاص باہمی کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے۔

جرمنی کا ایک مشہور فلاسفر یعنے شیلنگ ۱۷۷۵ء تا ۱۸۵۴ء اس طرح رقمطراز ہے۔ "جو کچھ ہم جانتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نہیں جانتے۔ اِس کے درمیان

[1] "فلسفۂ مذہب" صفحہ ۲۹۶ ڈاکٹر بی۔ کارپنٹر۔

جو اعلےٰ ترین اتحاد پایا جاتا ہے۔ اِس کے احساس اور علم کا نام مذہب ہے"[1] یہ فلسفیانہ توضیح ہے۔ اور ایسے شخص کی ہے جو علم کا حد درجہ شایق تھا۔ مگر ہم اسے سائنس ہی تک محدود نہیں کر سکتے۔ اسمیں سب قسم کا علم شامل ہے۔ مذہب کی یہ کوشش رہتی ہے۔ کہ جہانتک بن پڑے۔ کامل نمونہ کو حاصل کرے یعنے عابد کو معبود کی پاکیزگی اور کمال حاصل کرنے کی تحریک دے اور اُسے نمونۂ کامل کے حصول میں مدد دے۔

جرمنی کا مشہور ترین فلاسفر اور آئیڈیل ازم کا بانی اِمانوئل کینٹ (سنہ ۱۷۲۴ء تا سنہ ۱۸۰۴ء) مذہب کے معنوی پہلو پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "اپنے تمام فرائض کو تسلیم کرنا گویا وہ احکام رحمانی ہیں"۔ مذہب ہے۔ اس کے نزدیک فرض سب سے مقدم ہے۔ اور اُس کی حقیقت غیر محدود ہے۔ یہ فرض ہی ہے جو انسان کو چپکے چپکے آگے بڑھنے کی تحریک کرتا رہتا ہے۔ اِس کے خیال میں اخلاق مذہب کا مترادف ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے۔ کینٹ کا یہ خیال نہیں ہے۔ کہ فرائض اخلاقی فرائض ہیں اور اسلیے وہ حکم ربّانی پر قایم ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو تو اِس کے نزدیک یہ مذہب مکاشفہ ہوگا۔ برعکس اس کے وہ یہ کہتا ہے۔ چونکہ ہم بطور خود جانتے ہیں کہ وہ فرائض ہیں اسواسطے ہم انہیں احکام یزدانی سمجھتے ہیں۔ فکٹ[2] جرمنی کا ایک نہایت نامور فلاسفر اور کینٹ کا جانشین کہتا ہے مذہب بھی قابل عمل نہیں ہوتا اور اسکی علت غائی ہماری زندگیوں کی رہنمائی کرنا نہیں ہے۔ روزانہ زندگی کی ہدایت کے واسطے اِس کے خیال میں خالص

[1] فراک جلد اول صفحہ ۵۵ ۱۳۰

[2] فچٹ سنہ ۱۷۶۲ء سنہ ۱۸۱۴ء ۱۳۶

اخلاق بالکل کافی ہے۔ وہ کہتا ہے بگڑی ہوئی سوسائٹی ہی اسباب کی محتاج ہے۔ کہ وہ مذہب کو اخلاقی طرز عمل کا محرک بنائے۔ پھر وہ کہتا ہے۔ مذہب کیا ہے۔ علم ہے۔ اس سے انسان اپنی اندرونی حالت سے آگاہ ہوتا اور اہم ترین سوالات کے جوابات بہم پہونچاتا ہے اور ہمارے دل کو کامل خوشی اور راحت اور نفس کو پاکیزگی بخشتا ہے۔ وہ کہتا ہے:" مذہب اخلاق ہے جس سے ہم سب کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں۔

مذہب اخلاق کی زندہ طاقت ہے۔ جو اپنے تئیں متواتر اخلاقی کمال میں ظاہر کرتی رہتی ہے"۔ اس سے فرض کی غیر محدود حقیقت اور وسعت ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ایک اخلاقی کمال کے حصول پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ازلی اور غیر محدود ہے۔ یہ زندہ قوت ہے۔ جو برابر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ فرض اور اس کے پس پشت جو طاقت ہے۔ اس کے درمیان شاندار رشتہ دوامی ہے۔ فرض کی آنکھ نہ صرف اپنے منبع اور مصدر ہی پر لگی رہتی ہے۔ بلکہ آگے کا بھی خیال رکھتی ہے۔ ہمیشہ اور ہر آن اخلاقی کمالات کے حصول میں مشغول رہتی ہے۔ اسکی نوعیت میں دائمی ترقی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اسپی نوزہ[۲] جو یہودی اور ڈچ نسل کا ایک مشہور فلاسفر ہو گزرا ہے۔ کہتا ہے "خدا کی محبت جو اس کے کمالات ربانی کے علم[۳] پر مبنی ہو" مذہب ہے اسمیں ہی

---

۱؎ ٹینک۔ جلد اول صفحہ ۲۳

۲؎ اسپینوزا ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۷۷ء میں انتقال کیا۔

۳؎ گفورڈ لیکچرز" صفحہ ۶۶

اخلاقی قوت کی تحریک اور رفاقت ظاہر کی گئی ہے۔ روح محبت کے رشتہ سے خدا سے واسطہ ہے۔ اِس تصور میں احتیاج بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اِس خیال سے وہ قوت بھی عیاں ہوتی ہے جو شکر آمیز محبت پیدا کر سکتی ہے۔ یعنی عابد کی روح کے سامنے ایک محبوب موجود ہو جاتا ہے۔ کیپی تو زہ مذہب کو جذبات معنوی کا مجموعہ نہیں مانتا۔ اِن سب تعریفوں میں ایک غیر محدود ہستی جو ہمارے وجود سے بالکل جدا ہے۔ اور جو خود خدا یا اسکی برابر کا وجود ہے تسلیم کی گئی ہے۔

مشہور مورخ سر جان سیلے مصنف توسیع انگلستان "اپنی مشہور کتاب نیچرل ریلیجن" میں لکھتا ہے۔ مذہب ہماری جبلی اور دائمی حمد و ثنا کی قوت[1] کا نام ہے"۔ یہ خیال پروفیسر ممدوح کا ناقص معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم اور روشے اسکا مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب نامعلوم شئے کا تصور قایم کرتا ہے جس سے رشتہ قایم کرنا ممکن ہے۔ مذہب اوس عظیم طاقت کے وجود کا قائل ہے جو قدرت کے پس پشت ہے اور جس کے سامنے انسان سر تسلیم خم کرتا ہے۔ جرمنی کا سب سے مشہور فلاسفر مصنف گیٹی[2] کہتا ہے۔ "مذہب انسان کے اندر تین قسم کا احترام پیدا کرتا ہے جو کچھ اوپر ہے۔ اِس کے لیے اور جو کچھ ارد گرد ہے۔ اِس کے واسطے اور جو کچھ نیچے ہے اِس کے لیے تکریم و تعظیم پیدا ہوتی ہے +

(باقی آیندہ)

---

[1] نیچرل ریلیجن" مطبوعہ ۱۸۸۲ء صفحہ ۴۷۰۔ چوتھی فصل - ۱۲

[2] گوئٹے ۱۷۴۹ء - ۱۸۳۲ء

[3] نیچرل ریلیجن" پروفیسر میکس مولر صفحہ ۶۵ - ۱۲

# گنگا مائی

گنگا دنیا کے مشہور ترین دریاؤں میں سے ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔ جس بچے کو یہ معلوم ہو کہ دریا کسے کہتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتا ہوگا کہ گنگا کیا چیز ہے خصوصاً شمالی ہند میں تو اسکی اسقدر شہرت ہے کہ اس کے نام سے گیت گائے جاتے ہیں بہت کم گیت ایسے ہوں گے جن میں سونے کی تھلیا اور گنگا جل کا مذکور نہو۔ سونے کی تھلیا اس کی تعظیم کے واسطے ہے ورنہ مقصود اصلی گنگا جل ہے +

گنگا کا صاف ستھرا ٹھنڈا میٹھا اور مفید صحت پانی اپنی آپ نظیر ہے شیریں ایسا ہے کہ شاید کسی چشمہ کا پانی ایسا ہوگا۔ خنک ایسا کہ اس کے آگے برف کی ضرورت نہیں شفاف ایسا کہ دو دو گز کی گہرائی تک ایک ایک کنکری تہہ میں پڑی ہوئی صاف نظر آئے۔ ہاضم ایسا کہ سوڈا واٹر کو مات کرے۔ ہلکا ایسا کہ چاہے جتنا پی لو پیٹ میں بوجھ نہ معلوم ہو غرضکہ پانی میں جتنے اوصاف ہونے چاہئیں وہ سب اسمیں بوجوہ احسن موجود ہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کی صفت یہ ہے کہ اگر احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں خراب نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اور کسی جگہ کا پانی کتنی ہی احتیاط سے رکھو بہت جلد بگڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو ہندو اسکو اسقدر مقدس مانتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ الحق کہ یہ دریا اپنی خوبیوں کی بدولت ہر طرح اس تعظیم و تکریم کا مستحق ہے۔

دانایانِ ہند نے اِس کے سواحل کے مختلف مقامات پر میلے قایم کیئے ہیں جو مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں شامل ہونا موجب ثواب ٹھیرایا ہے۔ اِس غرض سے کہ جو لوگ دور و دراز مقامات کے رہنے والے ہیں وہ بھی میلہ کی شرکت کو کارِ ثواب سمجھکر سال میں کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور گنگا مائی کے درشن کریں اور اُس کا سُندر[۱] اور نرمل[۲] جل پی کر اور اوس میں اشنان کرکے اُس کے خواص مفیدہ سے مستفید ہوں۔ علاوہ اِس افادہ کے سفر اور اجتماع سے جو معقول فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یعنے تبدیلِ آب و ہوا تبادلۂ خیالات تجربات مشاہدات اور وسعت معلومات وغیرہ وہ مزید براں ہیں۔

اِن میلوں کی شرکت کو کارِ ثواب اِس غرض سے قرار دیا ہے کہ باشندگان ہند کی طبائع کسی امر کو خوشی سے نہیں قبول کرتیں اِلّا اُسکو جو منجانب مذہب ہو۔ علاوہ میلوں کی چند باتیں اور بھی ایسی مقرر کی ہیں یعنے تیرتھ[۳] یاترہ[۴] وغیرہ جن کی وجہ سے لاکھوں آدمی بلاتعین اوقات گنگا جی پر آمد و رفت رہتے ہیں۔ مثلاً ایک پھولوں[۵] کا اُس میں ڈالنا ہے کہ اِس غرض سے لاکھوں معتقدان مذہب سینکڑوں کوس سے مُردوں کی عظامِ سوختہ لے کر آتے ہیں اور گنگا مائی کے پرتاب[۶] سے استفادہ کرتے ہیں ✣

گنگا جی کیلاش کے پہاڑوں سے نکلی ہیں جو ملک تبت میں جھیل مانسرور

---

[۱] سندر۔ اچھا۔ [۲] نرمل۔ بے میل صاف [۳] مقام متبرک۔ زیارت گاہ [۴] زیارت متبرک مقامات میں جانا۔ [۵] مردہ کی جلی ہوئی ہڈیاں جنکو ہندو مردہ کو ثواب پہنچانے کی غرض سے گنگا میں ڈالتے ہیں۔ [۶] فیض برکت۔ ۱۲۔

کے قریب ہیں اور ہردوار کے قریب دیس سے نکلکر پردیس میں قدم رکھا ہے یعنے پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اِس مقام پر اور اس سے اوپر منبع کی طرف پانی بہت صاف و سرد ہے۔ اور جسقدر اوپر کی طرف جاؤ اُسے قدر ان دونوں اوصاف میں بیشی معلوم ہوگی۔ مگر دہانہ کی طرف یعنے میدانی حالت اِس سے قدرے مختلف ہے۔ اس طرف ان دونوں صفتوں میں کچھ کچھ کمی ہوتی جاتی ہے۔ خنکی تو آگے چلکر بالکل زائل ہو جاتی ہے مگر صفائی میں زیادہ کمی نہیں ہوتی۔

ہندوؤں کی مذہبی روایات کے بموجب اِس دریا کی خلقت اور اجرا کے متعلق عجیب وغریب قصے مشہور ہیں جو بظاہر سراسر خلافِ قیاس اور اسقدر غلط معلوم ہوتے ہیں کہ کوئی شخص اُن کو باور نہیں کر سکتا۔ واضح ہو کہ جملہ مذاہب عالم میں کم و بیش ایسی روایات ضرور ہیں جنسے بظاہر واقعات ناممکن الوقوع کا وقوع پذیر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جب ارباب فہم اُنپر غوض کرتے ہیں تو عدم امکان کا خیال رفع ہو جاتا ہے۔ قرین عقل ہے کہ اِس قصہ کا مطلب یہ نہو جو مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ یہ قصہ اسواسطے وضع کیا گیا ہو کہ لوگوں کے اعتقاد میں زیادتی ہو اور اُن کی توجہ اس متبرک دریا کی طرف زیادہ منعطف ہو۔

پہلے زمانہ میں جبکہ تہذیب و شائستگی کا ابتدائی دور تھا۔ تشبیہات و استعارات کی تصویریں بنا کر اپنا مطلب ظاہر کرتے تھے۔ خصوصاً ہندو۔ یونانی۔ مصری۔ اور رومی قومیں تو اِس بات کی عادی تہیں۔ اُن کے زمانہ میں عقل کا امتحان انہیں باتوں سے ہوتا تھا۔ جو شخص زیادہ صحیح تشبیہات اور سچے استعارات وضع کرتا وہ زیادہ عقلمند سمجھا جاتا۔

اور فی الواقع اسمیں عقل کا پورا امتحان ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی تصاویر
میں دیکھا ہوگا کہ بعض آدمیوں کے کئی کئی ہاتھ اور کئی کئی چہرے ہوتے ہیں۔
اِس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ در اصل ایک آدمی کے کئی ہاتھ یا کئی چہرہ
ہیں۔ ایک شخص کے کئی ہاتھ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اُس میں کئی آمیونکی
قوت ہے۔ کیونکہ انسان کی قوت کا اظہار عموماً ہاتھ کے ذریعہ سے ہوتا
ہے۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب انکی شہزوری کی وجہ سے
ید اللہ تھا۔ اگر تصویر میں ایک آدمی کے آٹھ ہاتھ بنائے جائیں تو اُسکا
یہ مطلب ہے کہ اُس میں چار آدمیوں کے برابر طاقت ہے۔ اسیطرح
ایک آدمی کے کئی چہرہ ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اُس میں کئی آدمیوں
کے ایسے اوصاف ہیں جو چشم وگوش۔ اور دماغ وغیرہ سے تعلق
رکھتے ہیں۔

ہندوؤں کے قدیم مصورین نے لنکا کے مشہور راجہ راون کی ایسی
تصویر بنائی ہے جسمیں بیس ہاتھ اور گیارہ سر ہیں۔ دس سر آدمیوں کے
سے ہیں ایک سر گدھے جیسا۔ دنیا میں کبھی کوئی آدمی اِس شکل کا نہیں
ہوا۔ مگر ناواقف ہنود یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ سچ مچ راون کے گیارہ سر
اور بیس ہاتھ تھے اور اِسکی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ راکھشس[1] تھا حالانکہ
صحیح یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ وہ بالکل ایسا ہی آدمی تھا جیسے اُس زمانہ میں
اور تھے فرق صرف اتنا تھا کہ وہ غیر معمولی طاقت رکھتا تھا۔ اُس کی تصویر
کے بیس ہاتھ اُس کی غیر معمولی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اِس زمانہ
میں بھی ایسے آدمی موجود ہیں جو تنہا کئی کئی آدمیوں کی قوت رکھتے ہیں۔

[1] دیو۔

مدراس کے مشہور پہلوان پروفیسر رام مورتی کی نسبت سنا ہے کہ وہ چلتی ہوئی موٹر کار کو پکڑ کر ٹھیرا لیتے ہیں۔ حالانکہ معمولی دس پندرہ آدمی بھی ملکر ایسا نہیں کر سکتے۔ تصویر کے دس سر جو آدمیوں جیسے ہیں راون کی دماغی قابلیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور گیارہواں جو گدھے جیسا ہے اس کی حماقت کا وہ بڑا ودیاوان اور زبردست پنڈت تھا ہر پرکار کی ودیا میں دخل رکھتا تھا۔ اسکی لیاقت ویدوں کی ایک ٹیکا کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے جو آجتک مستند ہے اور ایسی ہے کہ اب تک کسی سے ویسی نہیں لکھی گئی اور حماقت بھی اس سے ایسی سرزد ہوئی ہے کہ کبھی کسی سے نہ ہوئی ہوگی وہ حماقت اس سے سری رامچندر جی کی پیاری استری یعنی عصمت مآب و عفت انتساب سیتاجی کے ہبکا کر لیجانے اور پھر رامچندر جی سے ساتھ جنگ کرنے کی شکل میں نمایاں ہوئی۔

مصر کے باشندے تصویریں بنا کر اپنا مطلب ظاہر کرتے تھے۔ ہر تصویر بجائے خود ایک مکمل جملہ ہوتی تھی اور اس طرح ترتیب وار بناتے تھے جس طرح تحریر میں ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ لکھتے ہیں۔

بعض دواؤں کے اشتہارات میں دیکھا ہے کہ ایک ہی آدمی کی دو تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک حالتِ مرض کی بہت ضعیف و نحیف دوسری حالتِ صحت کی نہایت توانا و تندرست۔ مطلب اسکا یہ ہوتا ہے کہ بیماری نے ایسی بری حالت کر دی تھی۔ مگر اس اشتہار کی دوا نے پھر اچھا کر دیا۔ مذہبی روایتوں میں جو باتیں بعید از عقل معلوم ہوتی ہیں وہ قریب تر از عقل ہوتی ہیں فقط سمجھنے والوں کی سمجھ کا پھیر ہے۔

۱؎ عالم۔ ۲؎ قسم۔ ۳؎ علم۔ ۴؎ تفسیر۔ ۵؎ بزرگ ۶؎ زوجہ۔ ۱۲۔

گنگا مائی کا قصہ دلچسپ سمجھنے کے واسطے راجہ اندر کا تھوڑا سا حال جاننا ضروری ہے۔ بغیر اس کے یہ قصہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لہذا مناسب ہے کہ پہلے اسکا حال مختصراً عرض کر دیا جائے +

# (راجہ اندر کا حال)

یوں کہتے ہیں کہنے والے کہ اب سے بہت پہلے جس زمانہ کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور نہ قیاس اُس کا اندازہ کر سکتا ہے ایک بڑا زبردست راجہ اندر کے نام سے گذرا ہے اُس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سخت ترین عبادت و ریاضت میں صرف کیا اور سَو یگ[۱] کئے۔ خدا نے خوش ہو کر اس محنت شاقہ کے صلہ میں اُسکو جیتے جی آسمانی بادشاہت اور حیاتِ ابدی عطا فرمائی جن و پری دیو بھوت وغیرہ آتشی مخلوقات اُس کے قبضہ میں ہے۔ مجملہ اسباب راحت ہر وقت اُس کے واسطے مہیا ہیں مگر ساتھ ہی اِس کے ایک ایسا فکر عظیم دامنگیر ہے جسکی وجہ سے کبھی وقت بفکری نصیب نہیں ہوتی۔ دنیا کی راحتوں کی طرح وہاں کی راحتیں بھی اُس کے واسطے رنج سے خالی نہیں۔ آسمانی بادشاہت میں بھی آسمان کے جور و جفا سے نجات نہ ملے۔ کیا خوب کہا ہے۔ حضرت سودا نے۔

---

[۱] یگ ایک قسم کی عبادت ہے جس میں لاکھوں آدمیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ خیرات کرتے ہیں اور بہت سی آگ جلا کر اُس میں خوشبوئیں ڈالتے ہیں۔ بخور کرتے ہیں۔ اور یگ کرنے کی حالت میں کسی کا کوئی سوال رد نہیں کرتے۔ یہ عبادت بڑے بڑے راجہ کرتے ہیں ۱۲

گنج کوئی مار سے خالی نہیں۔
دامن گل خار سے خالی نہیں

وہ فکر عظیم جو ہر وقت اُسکو بے چین رکھتا ہے یہ ہے کہ اُس کا یہ خیال ہے کہ جو شخص عبادت و ریاضت اور یگ کرنے میں اُس سے سبقت لیجائیگا وہ اُس کی جگہ آسمانی بادشاہت کا مالک ہو جائیگا۔ اسوجہ سے وہ ہمیشہ اِس خیال میں رہتا ہے کہ کوئی اُس سے بڑہنے نہ پائے۔ جسکو زیادہ عبادت اور یگ کرتے ہوئے دیکھتا ہے اُسکو چھل بٹے دے کر کسی نہ کسی طرح گمراہ کر دیتا ہے اور اُس کے یگ میں کھنڈت ڈالدیتا ہے۔ جن وپری کا وہ مالک ہے اور ایسے ایسے حور کے بچے۔ نور کے ٹکڑے اُس کے قبضہ میں ہیں جن کے حُسن گلو سوز سے بتان فرخار شرمندہ ہوتے ہیں۔ پس جسکو چاہتا ہے اُن کے ذریعے سے دہوکا دیدیتا ہے۔ بڑے بڑے عبّاد و زہّاد کو صراط المستقیم سے ہٹا دیا۔ جس کی ایسی رعیت ہو اُس کے نزدیک کسیکو گمراہ کر دینا کیا بڑی بات ہے۔

## گنگا مائی کی پیدائیش

سُنا ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک راجہ تھا جسکا نام راجہ بل تھا ایک دفعہ اُس نے بڑا بھاری یگ کیا اطراف و اکناف عالم سے مخلوق آکر اسمیں شریک ہوئی۔ اُس یگ میں ایک غریب برہمن نے اِس کے سامنے آکر ڈنڈوت کی اور اشیرباد[1] دیکریوں ارداس[2] کی کہ ایشور پرماتما مہاراج

---

[1] اشیرباد۔ دعا۔ ۱۲ [2] ارداس۔ عرض۔ ۱۲

ادھیراج کو سدا سکھی رکھے جب سے شری برہما[۱] جی نے اِس سرشٹی[۲] کو رچا[۳] ہے تب سے آجتک کسی نے ایسا یگ نہیں کیا۔ لاکھوں کروڑوں کا دان پُن ہو رہا ہے دیس دیس چرچا ہے۔ میں بہت دکھی اور نردھن[۴] آدمی ہوں۔ مجھپر بھی دیا ہو جائے راجہ نے کہا کہ پنڈت جی جو تمہارے من میں آئے لیلو برہمن نے کہا کہ مہاراج میں کچھ اور نہیں چاہتا ایک ساڑھے تین پیر[۵] دھرتی اپنے راج میں سے دے دو بڑی کرپا[۶] ہو گی۔ اُسوقت راجہ کا گرو بھی وہاں موجود تھا اُس نے راجہ سے کہا کہ یہ برہمن نہیں ہے کوئی چھلیا ہے تجھے چھلتا ہے دیکھہ اِس کے چھل میں نہ آئیو اور ایک چپہ بھر زمین اسکو نہ دیجیو۔ مگر راجہ نے اُسکا کہنا نہ مانا اور کہا کہ اب میں نے یگ کیا ہے تو یہ مناسب نہیں کہ ایک برہمن کا سوال رد کر دوں۔ پھر شنکلپ[۷] کر کے برہمن سے کہا کہ پنڈت جی تم شوق سے تین قدم زمین لے لو۔ برہمن نے پہلا ہی جو قدم رکھا وہ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ وہاں برہما نے فوراً اُسکو دھوکر اُسکا پانی اپنے کمنڈل[۸] میں رکھہ لیا۔ کیونکہ اُس قدم میں پدم تھا۔ اور پدم سوائے خدا کے اور کسی کے پاؤں میں نہیں ہوتا۔ وہی پانی گنگا جی کی اصل ہے۔ اسیوجہ سے اس میں اِس قدر اوصاف ہیں اور کیوں نہوں جبکہ وہ خدا کے پاؤں کا دھوون ہے +

---

[۱] برہما۔ خالق۔ [۲] سرشٹی۔ عالم [۳] رچا ہے۔ پیدا کیا ہے [۴] نردھن مفلس [۵] پیر۔ قدم [۶] کرپا۔ مہربانی [۷] شنکلپ۔ ایک چلو میں پانی لیکر کچھہ منتر پڑھتے ہیں اور پھر اسکو زمین پر ڈالدیتے ہیں اِس کے یہ معنے کہ عہد واثق ہوگیا جیسے اِس زمانہ میں رجسٹری ہوتی ہے [۸] کمنڈل۔ کشکول۔ ۱۲

# گنگا جی کا نزول دنیا میں

روایت کرتے ہیں کرنے والے کہ اگلے وقتوں میں ایک راجہ تھا جسکا نام راجہ سگر تھا وہ بڑا مہاتما[1] تھا شام سویرے اُجالے اندھیرے ہر گھڑی ہر پل من میں ایشور کا دھیان رکھتا تھا۔ ایک دن اُسکو یہ گیان[2] ہوا کہ کوئی چیز انسان کو بُرے کرموں[3] کے پھل سے نہیں بچا سکتی۔ جو کچھ وہ کرے اُسکا بھوگنا لازم ہے اور دشوار ہے یہ کہ کوئی شخص اِس دار البوار میں سکون و قرار کے ساتھ رہ سکے۔ علائق دنیوی میں پھنسکر بُرے کرموں سے محفوظ رہنا از بس مشکل ہے۔ اِس کی محبت اچھی نہیں۔ اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَطَالِبُہَا کِلَابٌ۔ پس اِس جیفہ و کثیفہ کا ترک کرنا بہتر ہے۔ یہ خیال کرکے اپنے راج پاٹ کو تیاگ[4] دیا اور راج دہانی[5] سے نکلکر دور دراز یورپ کے مُلکوں میں چلا گیا۔ اور سمندر کے کنارہ بیٹھکر جپ تپ کرنے لگا۔ ہزاروں برس خشوع خضوع کے ساتھ عبادت کی۔ اِس کے صلہ میں ایشور پرماتما نے اُسکو یہ شکتی عطا فرمائی کہ جسکو آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے وہ فوراً بھسم[6] ہو جائے۔ کئی ہزار برس کے بعد اُس کے خاندان میں ایک راجہ۔ راجہ تیھو کے نام سے ہوا۔ وہ بھی بہت نیک نفس اور خدا رسیدہ آدمی تھا ہر وقت من میں ایشور کی چنتا[7] رکھتا تھا۔ اُس نے سو یگ کیئے اور آخر میں ایک اشومیدھ[8] یگ کیا۔

---

[1] مقدس۔ خداشناس [2] علم عقل۔ [3] اعمال [4] ترک کر دیا چھوڑ دیا۔ ۱۲

[5] دار السلطنت۔ [6] راکھ [7] دھیان خیال۔ [8] اشو بر وزن سترو یعنی اسپ میدھ بر وزن بید۔ اِس کے معنے ہیں اختلاف ہے۔ مگر یہاں اِس کے معنے آزاد کرنے کے

جب راجہ اندر نے یہہ دیکھا کہ راجہ تپھو عبادت اور یگ میں اُس کے برابر ہوگیا اور اشومید یگ کے پورے ہوجانے سے اُس سے بڑھ جائیگا اور اندر اُس چھین لیگا تو اُسنے ارادہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُس کے یگ میں رخنہ ڈالدے اور کوئی ایسی ترکیب کرے جس سے یگ نشپھل ہو جائے۔ جب یگ کے سمپورن ہونے میں بہت کم عرصہ رہگیا تو ایک ترکیب اُسکی سمجھ میں آئی اور اُس نے گھوڑے کو پکڑکر راجہ سگر کے پاس ایک درخت سے باندھدیا۔ جو فوج گھوڑے کی حفاظت کے واسطے مامور تھی اُس نے راجہ کو خبر کی کہ گھوڑا ایکایک غائب ہوگیا بہت تلاش کیا نہیں ملا۔ راجہ نے اپنے خاندان اور فوج کے آدمیوں کو جن کے تعداد ساٹھہ ہزار تھی گھوڑے کو ڈھونڈھنے کے واسطے بہیجا۔ اِس جم غفیر نے پہلے تین کھونٹ میں تلاش کیا۔ مگر کچھہ سُراغ نہ چلا۔ جب چوتھے کھونٹ میں گئے تو دیکھا کہ ایک بُڈھا آدمی آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے اور رام نام کی مالا جپ رہا ہے اُنھوں نے دیکھہ کر کہا کہ دیکھو اِس مکار بڈھے کو کیسا ایشور کا بھگت بنا بیٹھا ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶) سمجھے جاتے ہیں یگ بروزن رگ ایک قسم کی عبادت اُس کے معنے اِس مضمون میں عرض کیے جاچکے ہیں یہ ایک طرح کا یگ ہوتا ہے اور اسطرح ہوتا ہے کہ ایک بیش قیمت گھوڑے پر آلات حرب سجا کر اُسکو آزاد کردیتے ہیں اور تھوڑی سی فوج اُسکی حفاظت کے واسطے مامور کیجاتی ہے۔ جہاں جہاں وہ گھوڑا گذرتا ہے وہاں وہاں اُس یگ کرنیوالے راجہ کی حکومت ہوجاتی ہے۔ اگر وہ گھوڑا کسی دوسرے راجہ کی حد میں چلا جاتا اور وہ اُسکو پکڑ کر باندھ لیتے کیونکہ کوئی راجہ اپنی سلطنت کی ایک قدم زمین بھی بغیر جنگ کئے ضائع نہیں کرنی چاہتا تو یگ کرنیوالے کا فرض ہے کہ تاریخ گرفتاری سے سال بھر کے اندر گھوڑے کو چھڑالے۔ ورنہ یگ بے سود ہوجائے گا۔ ۵۱ اندر کی گدی ۵۲ بے ثمر بے نتیجہ۔ ۵۳ کمل۔ پورا ۵۴ معتقد۔

گھوڑا تو چرا کر باندھ لیا اور اب ہمکو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے رام رام کرنے لگا
راجہ سگر نے جو آدمیوں کی آواز سنی تو آنکھ اوٹھا کر دیکھا۔ نظر پڑتے
ہی سب بھسم ہو گئے۔ جب راجہ تیھو کو یہ خبر وحشت اثر پہنچی تو بہت پریشان
ہوا گدی سے جی ہٹ گیا۔ اور جو لوگ بھسم ہو گئے تھے اُن کی آتما کو
ٹھنڈا کرنے کی غرض سے گنگا جل لانے کا قصد کیا۔ سلطنت چھوڑ کر
پہاڑوں میں چلا گیا اور گنگا جل کے حاصل کرنے کی غرض سے دس ہزار
برس تک عبادت کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ اور وہیں پہاڑوں میں گپت[1] ہو گیا
راجہ تیھو کے بعد اُس کے خاندان میں راجہ بھاگیرت جی ہوئے اُنھوں نے
بھی اپنے پتروں[2] کی مکتی کے واسطے گنگا مائی کو دُنیا میں لانے کا ارادہ کیا
تاکہ اس کا جل اُن کے خاکستر پر چھڑکیں۔ اِس غرض سے اُنھوں نے
سری برہما جی کی تپشیا کی جن کے کمنڈل میں گنگا جی تھیں ایک مدت
مدید اور عرصہ بعید کے بعد برہما جی نے بھاگیرت جی کی تپشیا سے پرسن
ہو کر یہ بردان[3] دیا کہ گنگا تو تمکو ملے گی پرنت[4] پرتھوی[5] میں اتنی شکتی
نہیں کہ اسکو سہار سکے۔ تم شیو جی سے پرارتھنا کرو۔ بھاگیرت جی نے
عرصہ دراز تک شیو جی کی تپشیا کی تا اینکہ شیو جی نے خوش ہو کر فرمایا
ہم تمہاری خاطر سے گنگا جی کو سہار لیں گے۔ چنانچہ گنگا بیکنٹھ سے اُتر کر انکی
جٹا میں آ گئی مگر ایک مدت تک اُنکی جٹا ہی میں رہی۔ بھاگیرت جی نے جب یہ دیکھا کہ آسمان
سے گرا کھجور میں اٹکا تو بہت گھبرائے اور پھر شیو جی کی تپشیا کی بالآخر شیو جی اُن سے
یہ کہا کہ تم نے ہماری بہت بھگتی کی ہے لو اب گنگا کو لیجاؤ یہ کہہ کر اپنی جٹا کا ایک
بال توڑا۔ بال کے توڑتے ہی گنگا بہہ نکلی۔ اور اب تک بہہ رہی ہے۔ اور جبتک
ایشور پرماتما کی اِچھا ہے یونہیں بہتی رہے گی۔ اسعد حسین۔

[1] گپت گم [2] پترا باپ دادا۔ [3] بردان فرد۔ [4] پرنت مگر [5] پرتھوی دنیا ۱۲

# "وہ"

کھانے سے فارغ ہو اور ننھے کو ساتھ گاڑی میں بٹھا "وہ" تو کچہری کیطرف روانہ ہوئے اور میں اپنے کمرہ میں جا کر ناصر دلہن کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی۔ اُنکا خط آئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ مگر اللہ رکھے قیصر نے اتنی فرصت نہ لینے دی کہ چین سے بیٹھکر دو سطریں تو لکھدیتی۔ بارے آج خدا خدا کر کے اُسکو باپ کے ساتھ کر دیا۔ "وہ" تو بہتیرا کہتے رہے کہ میں اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔ میرا کچھ ٹھیک نہیں گھڑی بھر میں ضلع میں ہونگا گھڑی میں ڈویژنل کورٹ جانا پڑے گا یہ کہاں کہاں میرے ہمراہ پھریگا۔ مگر جب میں نے خفا ہو کر کہا کہ اگر قیصر کی جان تم کو ایسی دوبھر معلوم ہوتی ہے تو لیجانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اِس پر اُن کو سوائے اِس کے اور کچھ جواب نہ بن آیا کہ میں تو اِسی کی خاطر کہتا تھا کہ خواہ مخواہ ہلکان ہوگا قیصر کو میں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اگر آ کا میاں نہ لے چلیں تو تم ضد کر کے ساتھ جانا۔ غرض اِس طرح بڑی مشکل سے باپ بیٹوں کو اُدھر روانہ کر کے جواب لکھنے کے لیے کچھ وقت نکالا۔

ناصر دلہن کا خط ماشاء اللہ ایک دفتر کا دفتر تھا۔ انکی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور چونکہ خود علاوہ ذہین ہونے کے موجودہ روش کیموافق اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور میری اُن کی اکثر پردہ اور دیگر رسوم قبیحہ پر بحث ہوا کرتی تھی اِسی لیے اِس خط کا جواب جو اونہوں نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ لکھا تھا خصوصیت کے ساتھ غور طلب تھا زیادہ تر اسوجہ سے

کہ اوس میں وہ قلبی جذبات مندرج تھے۔ جن کا احساس کم و بیش ہر روشن خیال لڑکی کو شادی کے بعد ہوتا ہے۔ اور میں یہ چاہتی تھی کہ اس کے جواب میں اُن کی دلچسپ تحریر پر ایک معقول ریویو بھیجوں۔ اُنکی دلچسپی کا اندازہ اِن چند فقروں سے ہوسکتا ہے جو میں ذیل میں تحریر کرتی ہوں:-

"کل تیسرے پہر کو اماں جان تو اپنی بہاوج کی خیر صلاح کو گئیں وہ عرصے سے بیمار ہیں۔ کوئی کہتا ہے دق ہوگئی ہے کوئی کہتا ہے جگر کا فعل خراب ہے۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں اللہ اُن کو جلد شفا دے۔ اماں جان سے چلتے چلتے میں نے کہدیا تھا کہ آپ شام تک ضرور واپس تشریف لے آئیں اُنہوں نے کہا دیکھو بیٹی! جیسا موقع ہوگا ویسا کروں گی مگر مجھکو دکھائی نہیں دیتا کہ وہ لوگ آج آنے دیں گے۔ اِن کے جانے سے گھر میں فقط میں اور نصیرہ (میری نند) باقی رہگئے نوکروں میں بی مغلانی نصیرہ کی دوا۔ گھر کی ماما اور میری ساتھ والی یہ چار آدمی تھے۔ اتنا بڑا گھر اماں جان کے نہونے سے سونا معلوم ہونے لگا۔ اصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کے گھر میں ہونے سے کچھ دل کو اطمینان سا رہتا ہے۔ تم میری طبیعت سے واقف ہو۔ میں اُن لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں جو خواہ مخواہ ساس کی دشمن بنجاتی ہیں اور ماں بیٹوں میں تفرقہ ڈلوا دیتی ہیں۔ دوسرے میری ساس بھی تمہاری اماں جان کی طرح خوش مزاج ہیں اور میرا دل رکھنے کے لیئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ سمجھو میں نے

جس لیے یہ تمہید اوٹھائی ہے اُس کے مقطع کا بند یہ ہے کہ
میدان خالی دیکھکر ناصر نے کہا کہ آج میں تمکو ضرور تماشے
میں لے چلوں گا اتنے دنوں سے میں موقع کی تاک میں
تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جو اماں جان ایک رات
کی رات کہیں ملنے چلی جائیں۔ اسپر میں نے جواب دیا۔ ناصر!
تمہاری تو عقل جاتی رہی ہے اگر اماں جان کے کان میں
اِس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔
تم تو مرد ہو کے چھوٹ جاؤ گے اور میری شامت آئے گی۔ وہ مجھے
یہ نہ کہیں گی کہ بیٹی اگر یہ بے وقوف تھا تو تم تو ماشاءاللہ
پڑھی لکھی ہوشیار تھیں تم نے اتنی بات نہ سوچی کہ شریفوں کی
بہو بیٹیاں ناچ رنگ تھیٹر ویٹر میں نہیں جایا کرتیں۔ تو بھلا
بتاؤ میں کیا جواب دوں گی۔ وہ بولے "ڈیر کنیزہ" میں تو تمکو
اتنا کنسر وٹیو نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے کہا مجکو تمہاری اِس
عادت سے حد نفرت ہے کہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں
خواہمخواہ انگریزی کے الفاظ ٹھوس دیتے ہو۔ اِس سے
سننے والوں پر فقط یہ اثر ہوتا ہے کہ نہ تم کو اپنی زبان آتی ہے
اور نہ انگریزی کا حق ادا کرتے ہو۔ خیر مختصر یہ کہ مجھکو چاہے
دقیانوسی خیال کہو اور چاہے روشن خیال مگر مجھ سے ہرگز
یہ نہیں ہونے کا کہ بغیر اماں جان کی اجازت لیئے تمہارے
کہے میں آکر تھیٹر چلی چلوں۔ اگر ایسا ہی لے جانے کے
لیے دل بیقرار ہے تو اپنی والدہ صاحبہ کی خوشامد درآمد

کرکے اُن کو راضی کرلو۔ مگر اِن کے سر پر تماشے کا کچھ ایسا
جن سوار تھا کہ میرے کہے کا خاک اثر نہوا۔ اور جب یہ دیکھا کہ
میں دلیلوں سے قابو میں آنے والی نہیں تو آخر قسموں پر اُتر
آئے اور کہنے لگے کنیزہ اگر تمہیں میرا مردہ ہی دیکھنا نصیب
ہو جواب سے چلنے سے انکار کرو۔ میں نے بہتیرا دونوں
ہاتھوں سے منہ بھینچا کہ یہ الفاظ اُن کی زبان سے نہ نکلیں
مگر بھلا کہاں میں اور کہاں وہ۔ چار و ناچار۔ اُن کا کہا ماننا
پڑا۔ تم ہی بتاؤ اِس حالت میں اگر برابر انکار کیئے جاتی تو
خدانخواستہ اِن کے دشمنوں کا مردہ دیکھنا تو مقصود
تھا ہی نہیں ........ وغیرہ وغیرہ"

غرض اِس طرح کی پُر لطف باتوں سے سارا خط بھرا پڑا تھا۔ مگر مجھکو
جس سے اچنبہ ہوا وہ کنیزہ کا طرزِ خطاب تھا۔ یعنی انکا خاوند کا نام لے کر
پکارنا۔ جواب خط تو میں نے لکھکر ڈالوا دیا۔ مگر اُس کے بعد دیر تک
اسی مسئلہ پر غور کرتی رہی کہ ہم ہندوستانیوں کو یہ زیبا ہے کہ میاں
بیوی آپس میں نام لے کر پکاریں یا نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دیکھو اِ مجھے
آج بیاہے ہوئے پورے تین سال ہونے کو آئے مگر میں نے آجتک
کبھی اُن کا نام لے کر نہیں پکارا۔ اور نہ انہوں نے یہ زور دیا کہ تم میرا نام
لے کر پکارا کرو۔ آخر ماشاء اللہ وہ بھی تو ناصر کی طرح تین سال ولایت
میں رہ آئے ہیں۔ اور اُن کے دماغ میں جو آزاد خیالی ہے وہ تو میں
جانتی ہوں شاید ہی کسی میں ہو پھر اُن کا اِس معاملہ پر خاموش
رہنا ضرور کوئی نہ کوئی معنے رکھتا ہے۔ اسی لیے یہ سوچکر بیٹھ گئی کہ

آج شام کو اِس کا تذکرہ کروں گی چونکہ اتنے عرصہ سے کبھی نام نہیں لیا تہا
دل ہی دل میں اُن کا نام پھر رہا تھا۔ لیکن زبان سے نہ نکلتا تھا۔ میں نے
بہتیری کوشش کی کہ کئی دفعہ پکار پکار کر ان کا نام لوں تاکہ مشق ہو جائے
اور اگر اُن کی خوشی اِسی میں ہوئی کہ میرا نام لیا جائے تو کچا پن نہ پایا جائے
مگر دل میں کچھ ایسی ہچکچاہٹ بیٹھ گئی تہی کہ زبان سے حرف نہ نکلتے تہے
میں نے تنگ آکر قلم اوٹھایا ایک کاغذ کے پرچے پر اُن کا نام لکھنا شروع
کر دیا اور بار بار اُس کو پڑھنے لگی جب جاکے اتنی مہارت ہوئی کہ بے تامل
دو ایک دفعہ خود بخود نام زبان پر آجاتا ہے۔ اِس نام کے ساتھ شادی
کے بعد کی ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور اُن کی
ذرا ذرا سی بات کارہ رہ کے خیال آنے لگا۔ اول ہی روز سے جو آزادی
انہوں نے مجھکو دے رکھی ہے اُس کی میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ اگرچہ
کبھی اُن کے منہ پر شکریہ کا اظہار نہیں کیا۔ میرے ساتھ ایسے ادب سے
پیش آتے ہیں جیسے کوئی شاہی دربار میں اپنے رتبہ کا خیال رکھتا ہو
چھٹپن میں۔ میں سنا کرتی تہی کہ جو لڑکا ولایت ہو آتا ہے اُس کا دماغ
ساتویں آسمان پر پہونچ جاتا ہے اور وہ کسیکو خاطر میں نہیں لاتا اِس لیے
بیاہ سے پہلے جب کبھی خیال آتا تھا کہ یہ ولایت ہو آئے ہیں تو سہم کے
مارے میری روح فنا ہو جاتی تھی۔ یہی سوچتی تھی کہ دیکھئے تقدیر میں
کیا لکھا ہے۔ کہیں ایسا نہو کہ ولایت کی ساری خرابیوں کی پوٹ میرے
پلّے پڑے اور مجھکو دنیا ہی میں دوزخ ہو جائے۔ مگر شکر ہے اُس
پاک پروردگار کا کہ اُس نے میری فریاد سُن لی۔ اور ایسا شوہر دیا۔ جو
میرے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ البتہ ولایت نے جو اِن میں

نرالی بات پیدا کر دی وہ یہ ہے کہ جب مجھ پر بہت مہربان ہوتے ہیں تو اپنی
محبت جتانے میں کسیکا لحاظ نہیں کرتے اور نہ اُن کو ایسی بات کی پرواہ ہوتی
ہوتی ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو نام رکھیں گے چنانچہ اکثر صبح و شام دوپہر
جب اُن کا جی چاہے بے تامل میری پیشانی کو کسی ولی اللہ کی درگاہ کی
چوکھٹ سمجھ لیتے ہیں اور جو میں غصہ ہو کر کہتی ہوں کہ خدا نے تمہارے
دیدے میں حیا و شرم تو دی ہی نہیں تو بے غیرتی سے اُس کا یہ جواب
ملتا ہے کہ میں تو فقط اللہ اور رسول کا حکم بجا لاتا ہوں۔ اگر میں اپنی سچی
محبت کا اظہار کرتا ہوں تو بتاؤ کسی گناہ کا سزاوار ہوں؟ اس پر جل کر
میں یہی جواب دیتی ہوں کہ اللہ رسول نے کہیں یہ بھی نہیں فرمایا کہ تم
اپنی بیوی کے چہرے کو سب کے سامنے سنگِ اسود ہی بنا بیٹھو۔ بلا سے
میری رنگت سیاہ فام ہوتی کہ تم کو بہانہ ملجاتا۔ خیر لوگ چاہے اُن کی اس
بے حجابی پر کچھ ہی نام دھریں مگر میں دل سے ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ اکثر
خوش ہوتی ہوں یہ بات اور ہے کہ تا دمِ تحریر اُنپر یہ نہیں ظاہر ہونے
دیا کہ میری رائے اُن کی حرکات کیموافقت میں ہے اُن کو اب تک
یہ یقین کامل ہے کہ میں دراصل ناپسند کرتی ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اگر
میری تیوری پر ذرا سا بل آجائے تو بھلا مجال ہے کہ وہ کسی بات کی جرأت
کر سکیں میرے دل کی کیفیت معلوم کرنے میں جو ملکہ اُن کو حاصل ہے
اُسے دیکھکر مجھکو تعجب ہوتا ہے کہ مرد ذات ہو کر کیونکہ اسقدر کمال حاصل کر لیا
کہ میری طبیعت کے ہر پہلو سے واقفیت ہے جس طرف میرا
میلان دیکھنا اُدھر ہی خود بھی رجوع ہو جانا اور ہر وقت مجھکو خوش و خرم
رکھنے کی کوشش کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ انگلستان کی ساری

خوبیاں اُن میں مجتمع ہوگئی ہیں۔ مگر اِن تمام باتوں سے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میری اُن کی لڑائی نہیں ہوتی۔ خوب ہوتی ہے۔ اُس کی بنا یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ پڑھے ہوئے ہیں اور اِس میں شک نہیں کہ اُنکی قابلیت کا مقابلہ میرے فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔ مگر میری عادت یہ ہے کہ جو بات ایک دفعہ دماغ میں بیٹھ جائے وہ بڑی مشکل سے نکلتی ہے اور اِسی پر میری اُن کی بحث ہوتی ہے۔ مثلاً کئی روز کا ذکر ہے کہ وہ تو اپنے کمرہ میں بیٹھے مقدمات کے کاغذات دیکھ رہے تھے اور میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں امیر مینائی کا دیوان دیکھ رہی تھی۔ ہاں اِس سے پہلے میری اُنکی اِسبابپر دو دو ہو چکی تھی کہ امیر داغ سے بہتر ہے وہ کہتے تھے کہ نہیں داغ کا رتبہ اعلیٰ تریں ہے۔ اثنائے مطالعہ میں میری نظر اِس شعر پر پڑی۔

خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے
غنچوں کے وہ دہن ہیں بلبل کی جو زباں تھے

میں نے جھٹ اُنکو آواز دی کہ ذرا یہاں ہو جاؤ۔ وہ دوڑے دوڑے آئے میں نے مذکورہ بالا شعر دکھا کر کہا کہ کبھی تمہارے داغ کو بھی ایسا شعر لکھنا نصیب ہوا ہے۔ دیکھو کتنا سچا مضمون کن رعایتوں سے اور کن مختصر اور شستہ الفاظ میں باندھا ہے اِس پر وہ بولے کہ البتہ شعر اچھا ہے مگر اِس سے بہتر بہتر ہزاروں شعر داغ کے دیوان میں موجود ہیں۔ مگر میں یہی کہے گئی کہ تم ایک بھی نہیں دکھا سکتے۔ غرض اِس پر بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ میں خفا ہوگئی۔ انہوں نے داغ کا دیوان الٹ پلٹ کر سینکڑوں شعر میرے آگے ڈال دیئے میں نے بھی امیر مینائی کے عمدہ سے عمدہ جواہر اُن کے آگے بکھیر دیئے اور ساتھ ہی یہ چبھتا ہوا فقرہ بھی کہدیا کہ وہ جو انگریز

میں گائے کے سامنے موتی بکھیرنے کی نقل ہے وہ تم پر صادق ہو رہی ہے۔ اس پر وہ بولے
کہ خدا جانے مجھپر ہو رہی ہے یا تمپر۔ میں پہر یہی کہونگا کہ جو بات تم کو ایکدفعہ بھلی معلوم
ہو اس کی تعریف کرتے کرتے آسمان پر چڑھا دیتی ہو۔ میں امیر کو بُرا نہیں کہتا
اپنے زمانہ کا استاد تہا۔ مگر داغ پر اُسکو فوقیت دینا جہالت کی نشانی ہے
جہالت کا نام سنکر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور طنزاً میں نے
جواب دیا۔ کہ خیر میں جاہل سہی آپ تو بڑے عالم ہیں۔ مگر میں یہ جانتی ہوں
کہ اُردو زبان سمجھنے کی تمکو خاک تمیز نہیں۔ وہ بولے کہ اب آپ سے سبق
لینا شروع کروں گا۔ ہاں تو استانی جی غالب کے اِس شعر کے کیا معنی ہیں۔

رکھا غفلت نے دور اُفتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

اِس پر میں اور بھی جز بز ہوئی کیونکہ غالب کا یہ شعر جس کے معنے صاف
ہیں میرے جلانے کو اِس لیے پوچھا کہ گویا مجھکو اِس سیدھے سادے شعر
کے معنی بھی نہیں آتے۔ غرض جب اِسی طرح کی چھیڑ کر کرکے مجکو خوب
ستا لیا تو معافی کی درخواست ہوئی اُس کے جواب میں میں نے
کہا کہ بس اب تم مجھ سے بات نہ کرنا اور یہ کہکر کمرہ میں سے اُٹھ باہر دالان میں
اُسی روز خالہ جان آئی ہوئی تھیں اُن کے پاس جا بیٹھی وہ کہتے ہی رہے
کہ بات تو سنو! بات تو سنو! غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے میں سلیقے سے آئندہ
بحث کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مگر میں نے ایک نہ سنی۔ اُس کے بعد ایک
روز تک میں مطلق نہیں بولی۔ میری شکایت اپنی اماں جان کے پاس لے
گئے کہ آپ کی بہو صاحبہ مجھسے ناراض ہیں۔ اور کل سے ابتک بات نہیں
کی آپ ہی سفارش کرکے میرا قصور معاف کرا دیجئے۔ اُن کے سامنے تو

اماں جان میری طرف ہوکر بولتی ہیں کہ بیٹا تو ہر وقت اُسکو چھیڑتا رہتا ہے اِس لئے اُس کی خفگی بجا ہے مگر بعد میں مجھکو اپنے طور پر سمجھا دیتی ہیں کہ خاوند کا دل میلا کرنا اچھی بات نہیں مگر میں خود جانتی ہوں کہ میری خفگی کوئی سچ مچ کی تھوڑا ہی ہوتی ہے دوسرے اُن کو اِس میں خود مزا آتا ہے۔ بلکہ میں تو اِسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ ایسا خاوند ملا جو علمی معاملات میں بہت سے موقعوں پر مجھسے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مجھے ایسا شوہر ہرگز پسند نہیں کہ جو بیوی کا فقط ہاں جی کا نوکر ہو۔ اور اپنی گرہ کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ دوسرے ہم دونوں کی یہ عادت ہے کہ مثلاً میں کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں اور اسمیں کوئی نفیس مضمون ہے جو مجھکو بھلا معلوم ہوتا ہے تو مجھے اُسوقت تک چین نہیں آنے کا جب تک وہ مضمون اُن کو نہ دکھا لوں اور وہ تعریف نہ کریں اسیطرح جب کبھی کوئی شعر یا مضمون ان کو اچھا معلوم ہوتا ہے تو وہ مجھکو ضرور دکھاتے ہیں اور اُس کی تعریف چاہتے ہیں اور اگر ایک بات کو میں اچھا کہوں اور وہ مجھ سے اتفاق نہ کریں تو لڑائی ہوتی ہے مگر آخر میں وہی زبر رہتے ہیں کیونکہ درحقیقت اکثر میں غلطی پر ہوتی ہوں جیسا کہ بعد میں وہ ثابت کر دیتے ہیں۔ میں یہ دیکھتی ہوں کہ شادی کے یہ تین سال مجھکو پہاڑ معلوم ہوتے اگر میری اُنکی ہفتے میں دو ایک دفعہ لڑائی نہ ہوتی رہتی۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کل ہی شادی ہوئی ہے کیونکہ ہر اختلاف کے بعد محبت دُگنی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ ساری خفگی میرے ہی حصہ میں آگئی ہے اللہ رکھے وہ بھی خفا ہو جاتے ہیں مگر ان کی ناراضگی فقط دو ایک ہی گھنٹے تک رہتی ہے جہاں میں نے دو ایک چھینٹے دیئے

اور ٹھنڈے پڑ گئے اُسوقت میں اور کچھ کے دیتی ہوں کہ بس یہی خفگی تھی دو تین روز تک تو اور روٹھے رہتے۔ ہماری محبت کا نقشہ کاغذ پر کھینچا جائے تو اُسکی شکل اِس لکیر کی سی ہو گی

اخلاص
شادی
شکر رنجی

مگر بعض میاں بیوی میں ایسی محبت ہوتی ہے جیسے خط مستقیم
اخلاص یا لڑائی ـــــــــــــــــ شادی

کہ اگر محبت ہے تو وہ یکساں ایک حالت پر چلی جاتی ہے کہیں اُتار چڑھاؤ نہیں اور اگر خدانخواستہ ناسازگاری ہے تو بھی ایک حالت مگر میری اور اُن کی ایسی طبیعت واقع نہیں ہوئی ہے کہ محبت کی سیدھی مگر خشک اور غیر دلچسپ راہ پر برابر چلے جائیں اگر چھیڑ کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں ملتا تو وہ کوئی ایسا شگوفہ کھڑا کرلیتی ہیں۔ جسپر خواہ مخواہ میں روٹھوں چنانچہ مہینا بھر کا ذکر ہے کہ ہم کو ملاپ سے رہتے رہتے دو ہفتے ہو گئے تھے اور کوئی بات چھیڑ کی نہیں نکلی تھی۔ اِس سے میری طبیعت اکتا گئی اور انکا بھی جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھکو چھیڑیں۔ ایکدن میں بہت رات گئے سوئی تھی اور اِس لیے صبحکو معمول سے زیادہ دیر میں اٹھی خیر اُس دن تو مجھکو کچھ خبر نہیں ہوئی دوسرے دن کیا دیکھتی ہوں کہ اِن کے ہاتھ میں ایک فوٹو ہے اور اُسکی تعریفیں پہ تعریفیں ہو رہی ہیں اسپر میں نے کہا کہ لاؤ میں بھی تو دیکھوں کہ کیسی تصویر ہے۔ کہنے لگے تمہارے دکھانے کی نہیں ہے تم دیکھو گی تو مارے حسد کے آگ بگولا ہو جاؤ گی میں بولی حسد کرے میری بلا آخر مجھے بھی تو بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ اسپر آپنے نہایت متین صورت بنا کے کہنا شروع کیا کہ بات اصل یہ ہے کہ میری تمہاری تو بنتی نہیں اور نہ آیندہ بننے کی امید اِس لیے میرا ارادہ ہے کہ دوسری شادی کر دوں اور اب کے اچھی طرح دیکھ بھال کے بات ٹھیرائی ہے چنانچہ یہ تصویر اُسی لڑکی کی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ تصویر دور سے اپنے

ہاتھ میں لے کر مجھکو دکھائی۔ اُس میں ایک عورت سر سے پاؤں تک دوشالہ اوڑھے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی میں بولی کہ خیر دوسری شادی کرنی تمکو جم جم نصیب ہو اللہ کرے چار اور کرو۔ بھے جلنے کی کیا پڑی۔ حسد کرے میری جوتی کی نوک مگر اس فوٹو میں تمہاری چاہیتی کا نہ منہ کھلا ہے نہ ہاتھ یہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں جنپر آپکی ایسی طبیعت ریجھی ہے کہنے لگے جب وہ رشک قمر تمہارے سامنے آجائے گی تو خود دیکھ لوگی اگرچہ میں جانتی تھی کہ فقط مذاق کر رہے ہیں مگر اُن کا یہ کہنا کہ یہ تصویر بڑی مشکل سے سوتے میں لی گئی ہے کیونکہ جاگتے میں تو وہ ہرگز نہیں لواتی مذاق کو درجہ شبہ تک پہونچاتا تھا اور اس خیال سے میں کچھ چین بجبیں ہوگئی بس پھر کیا تھا اُن کی بن آئی اور مجھکو خوب بھڑکانا شروع کیا یہانتک کہ میں جل بھن کے پلنگ پر جا منہ ڈھانک کے چپکے چپکے رونے لگی۔ اسپر اُن کو تاب نہیں رہی اور دوڑے دوڑے آنکر تسلی وہ باتیں کرنے لگے مگر منہ پہ ہنسی کھیل رہی تھی اس سے مجھے اور بھی غصہ آیا۔ اور میں نے کہا جاؤ تمکو مجھ سے کیا کام اپنی پسند والی سے جا کر ایسی خوشامد کی باتیں کرو۔ بڑی دیر کے بعد جب اونہوں نے خوب دل بھر کے ستا لیا تو کہا ایک دفعہ تصویر کو قریب سے اور دیکھ لو۔ اور کہو تو میں یہاں بلا کر اس خود کو تمہیں دکھادوں میں نے کہا جی نہیں مجھے کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ مگر تصویر کو دیکھتی ہوں تو اُس میں میرا ہی دوشالہ وہی شبنمی اور پلنگ اور اپنے ہی گھر کی سامنے کی دیوار اب مجہپر عقدہ کھل گیا کہ یہ اُس روز جو میں دیر میں اُٹھی تھی تو انہوں نے مجھ سوتی کا فوٹو لیا۔ پھر آپنے مجھکو آئینے کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھو یہ وہی ماہ جبین ہے۔ میں نے کہا ہٹو مجھے ایسی خوشامدوں کی باتیں

پسند نہیں اُس کے بعد سے میں کبھی ان کے دھوکے میں نہیں آئی اگرچہ لڑائی
تو کئی دفعہ ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ اِسی قسم کے تمام گذشتہ واقعات میرے دل میں
سے گذر رہے تھے اور جو جو میں اِن کا خیال کرتی تھی وہ وہ مجھکو اُنکی قدر
ہوتی تھی اور دل سے بے اختیار یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا ہمیشہ ہمیشہ اُن کو خوش و
خرم رکھے اور مجکو اُنکی خدمت کی توفیق دے مجھے اِن خیالوں میں مستغرق
بیٹھے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے اِس پہ اماں جان نے ماما سے پوچھا نصیبن
دیکھنا بہو آرام کرتی ہیں یا اپنے کمرہ میں ہیں اُس نے کہا چھوٹی بیوی کمرہ میں
میز پر سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ اسپر اماں جان آنکر یوں مخاطب ہوئیں کہ بیٹی
کیسی طبیعت ہے مغموم کیوں بیٹھی ہو۔ میں بولی جی نہیں اماں جان میں مغموم تو نہیں
ہوں ایک مضمون سوچ رہی ہوں آج آپ کے صاحبزادے سے اُس پر بحث
کرونگی۔ بحث کا نام سنکر بیٹے کی محبت نے زور کیا اور کہنے لگیں کہ بیٹی ایک تم
پہلے ہی وہاں سے وہ تھکا ماندہ آئے گا یہ مقدمے والے اسکا بھیجا کھا جاتے
ہیں اور پھر تم بحث کرنی شروع کردو گی۔ دن بدن دُبلا ہوا جاتا ہے میرا کئی دن سے
ارادہ ہو رہا تھا کہ تم کو سمجھاؤں کہ اُس کے آرام کا خیال رکھو اور اُس سے
خواہ مخواہ نہ الجھا یا کرو۔ اُدھر عدالت میں وہ اپنا مغز خالی کرتا ہے اِدھر تم سے
کج بحثی ہوتی ہے آخر وہ آدمی ہے کتے کا بھیجا کہاں سے لائے جو ہر وقت
ہر بات کی جوابدہی کرتا رہے۔ اُس پر طرہ یہ کہ اگر کچھ ایسی ویسی بات ہو جائے تو تم
ناراض ہو جاتی ہو اُسکا الگ صدمہ ہوتا ہے غریب کی جان تو آئی میں ہے اگر بُرا
نہ مانو تو ایک بات کہوں کہ تم نے تو اپنے خاوند کو جوتی میں رکھ کر پہن ڈالا ہے
وہ تمہاری آسائش کے لیے ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے اور تمہاری
خوشی کے لیئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ روپے کو پانی بنا رکھا ہے کہ

کسی طرح سے تمھارا دل میلا ہو مگر تم ہو کہ کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتیں. دیکھو بیٹی میں تمھاری دشمن نہیں ہوں تم میرے گھر کی روشنی ہو میری اس سے زیادہ اور کیا آرزو ہو سکتی ہے کہ تم دونوں کو ہنسی خوشی دیکھوں۔ میں جو کچھ تم کو صلاح نصیحت کرتی ہوں وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے۔ جب اتنے دن سے دیکھ رہی ہوں کہ یہ گت میرے بچے کی ہوئی ہے تب آج ڈرتے ڈرتے زبان کھولی ہے کہ شاید تم پر کچھ اثر ہو۔ وہ تو تمھاری چاہت میں اندھا ہو رہا ہے نہ اسکو اپنے تن کا ہوش ہے نہ بدن کا جیسا تم نے کھلا دیا کھالیا۔ جیسا پہنا دیا پہن لیا مگر تم کو تو چاہیئے کہ ہر طرح کی نگہداشت رکھو۔ اماں جان تو یہ نصیحتیں فرما رہی تھیں اور مجکو دل ہی دل میں ہنسی آ رہی تھی۔ میں یہ سوچتی تھی کہ خیر ان کی تو ماں ہے اسوجہ سے ان کو لگتی ہے مگر میری تو دونوں جہان کی فلاح اسی شخص کی ذات پر منحصر ہے۔ میرا چین میرا آرام میری عزت حرمت۔ خوشی۔ اولاد۔ غرض دنیا کی ہر ایک نعمت اس ایک فرد بشر سے وابستہ ہے اگر وہ کہیں تو میں اپنا کلیجہ تک نکال کے رکھدوں اور پھر ایسا خاوند کہ اگر ساری عمر اس کے پاؤں دھو دھو کے پیوُں تو عین ثواب اور اگر فقط جوتیاں سیدھی کرنے میں تمام زندگی بسر ہو تو بھی حق خدمت نہ ادا ہو۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہ خود اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ میرا بڑا فرض اپنی بیوی کی خدمت کرنا ہے۔ اِس لیے اکثر ہماری باتوں سے ظاہرا دنیا کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقط میاں تو بیوی کا تابعدار ہے مگر بیوی خود مانع ہے۔ یہ خبر نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ خدا نے قدرتاً عورت کو قلیم محبت میں حکمراں بنایا ہے اس لیے مرد اگر فرض بندگی ادا کرے تو کوئی عیب نہیں۔ لیکن عورت کا اِس خاص قلیم میں مرد کا محکوم ہونا ایسا ہی خلاف مصلحت ہے جیسا مرد کا اپنی دنیوی

کاروبار میں عورت کی تابعداری کرنا۔ خیر اماں جان کا تو یہ کہکر میں نے اطمینان کرد یا کہ انشاءاللہ ضرور آپکی نصیحت پر عمل کروں گی مگر اُن کے ساتھ نام کے متعلق جو بحث کرنے کا ارادہ پختہ کرلیا تھا اُسکو نہیں توڑا۔ شام کو جب وہ کچہری سے واپس آئے تو دیکھتی کیا ہوں کہ میاں ننھے کی تیوری پر بل پڑا ہوا ہے میں سمجھ گئی کہ باپ نے کوئی کام خلاف مرضی کیا ہوگا چنانچہ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جج صاحب کے پاس سے ابھی نہ آتے تھے میں زبردستی لایا ہوں۔ میں نے کہا قیصر بیارے کل پھر چلے جانا خفا نہو۔ مگر تیوری کا بل نہ گیا۔ نرس نے ہاتھ منہ دُھلا کر کپڑے بدلے تو ذرا مزاج درست ہوا اور باپ کے پاس آنکر چار پینے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے غرض جب سب فارغ ہو چکے تو میں نے نرس سے کہا کہ دیکھنا ننھے کو نیند آتی معلوم ہوتی ہے وہ آنکر بہلا پھسلا کرلے گئی۔ اب فقط میں اور وہ میز پر رہگئے میں نے پوچھا کہ آج شام کو تمہیں کچھ زیادہ کام تو نہیں کرنا اگر کرنا ہو تو ابھی سے کہدو تاکہ میں اپنا ارادہ ملتوی کردوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ کام تو بہت ہے مگر آپ اپنا ارادہ ملتوی نہ کیجئے۔ آپکی خدمت میں ہر وقت حاضر ہوں۔ میں بولی کہ خیر طنز کی باتیں تو مجھے بھاتی نہیں مگر ہاں آج ایک معاملہ میں تم سے رائے لینی ہے اِس شرط پر کہ تم یہ اقرار کرو کہ معقول جواب دو گے یہ نہیں کہ جو میں کہوں وہ سب ٹھیک ہی۔ اسپر کہنے لگے کہ اچھا تو تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ اگر کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف میرے ذہن میں آئے تو اس کے اظہار سے تم ناراض تو نہو گی کیونکہ مجھکو مشکل سے مشکل مقدمے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرنی پڑتی جتنی آپ کے منانے کے لیئے۔

میں نے جب اُنکا پورے طور پر اطمینان دلادیا کہ ڈرو نہیں میں ہرگز خفا نہونگی۔ تو اس مضمون کی تمہید اسطرح اٹھائی کہ ناصر دلہن کے خط سے مجھکو

معلوم ہوا کہ وہ اپنے میاں کو نام لے کر پکارتی ہیں۔ خیر اُن کے میاں تو تمہاری طرح آزاد منش ہیں اُنکا بیوی کو نام لے کر خطاب کرنا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ تم تو اُن پر بھی سبقت لے گئے کہ شاعری کی ساری اصطلاحات میرے پر ختم کر دیں مگر عورت کو خاوند کا نام لینا کہاں تک بھلا معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ نام تو غیر مادّی شے ہے مثلاً تم نے آجتک کبھی میرا نام نہیں لیا۔ اگر سامنے ہوا تو نام کی ضرورت ہی نہیں اور غیبت میں تو "وہ" ہوں ہی۔ مجھکو یہی بھلا معلوم ہوتا ہے اگر تم کچھ اور کہنا پسند کرو تو وہ بھی امنّا و صدقنا۔

غرض تو دلی محبت اور اخلاص باطنی سے ہے نہ کہ ظاہری الفاظ سے لیکن اگر یہ پوچھتی ہو کہ عام طور پر اِس کا رواج دینا بھی مناسب ہے یا نہیں تو میری رائے میں چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ اول تو ہر گھر کے بزرگوں کو یہ طریقہ نہایت غیر مہذب معلوم ہوگا۔ دوسرے کوئی صریح فائدہ متصور نہیں۔ یہ ہر شخص کی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم نے اِس کے متعلق کیا رائے قایم کی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھکو تمہارے سے اتفاق ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچتی ہوں کہ یہ بات رواج پا جائے تو کچھ حرج بھی نہیں۔ اِس گفتگو کے بعد وہ تو مسجد میں عشا کی نماز کو چلے گئے اور میں باہر چوکی پر وضو کرنے کو بیٹھ گئی اور یہ قصہ تمام ہوا +

## نبت الوقت

خان بہادر مولوی خدا بخش خان صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ کے مفصل حالات جن کی تصویر آج ہدیۂ ناظرین ہے بوجہ عدم گنجایش درج نہو سکے آیندہ رسالہ میں لکھے جائیں گے +

# کلی کی بے کلی

نسیم نے مجھے آ آ کے گدگدایا ہے — اسی سے میرے لبوں پر تبسم آیا ہے
یہ میری بو کو نہ چھوڑیگی میں سمجھتی ہوں — مرے حجاب کو توڑیگی۔ میں سمجھتی ہوں
بنے گی ہاتھ۔ مرے پیرہن کو کھولیگی — کلید ہوکے یہ قفل دہن کو کھولے گی
اُڑیگا عارضِ طفلی سے رنگِ نادانی — شگفتگی مری۔ ہو جائے گی پریشانی
نصیب ہوگا نہ خاطر کو جمع پھر ہونا — کھلائیگا کوئی گل میرا منتشر ہونا
جو میں ہنسونگی تو گلچیں مجھے نہ چھوڑیگا — وہ سلسلہ مری حبِ وطن کا توڑیگا
مری رگوں میں نہ دوڑیگا چڑھ کے پھر پانی — نہ کام آئیگی شبنم کی قطرہ افشانی
ہوائے تازہ کو ترسونگی پاسکوں گی کہاں — چمن میں پھر اسے کھانیکو آسکوں گی کہاں
شجر کی شاخ نہ مجھکو نصیب پھر ہوگی — شعاعِ مہر نہ میرے قریب پھر ہوگی
کہاں یہ رات کو تاروں کی چھانو میں رہنا — جگر چھدیگا۔ بنوں گی میں ہار یا گہنا
گلے پڑوں گی میں جسکے وہ مل کے چھوڑیگا — مرے لباس کی نکہت بدل کے چھوڑیگا
یہ آبرو مرے چہرے کی آب ہی تک ہے — بہارِ حسن کی رنگِ شباب ہی تک ہے
لٹے بہار تو ہوجائے رنگ فق میرا — اُلٹ پلٹ کے ہو برباد ہر ورق میرا
جفائیں سہنے کو شاید جہاں میں آئی میں — ہوئی یہ چوک کہ حس اور جان لائی میں
مگر دہن نہ میسر ہوا کہ بول سکوں — جگر کی چوٹ کا پردہ زباں سے کھول سکوں
کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈرا و گلچیں — یہ بے زبان ہے نہ اس پر ستم کرا و گلچیں
وہ کیا سنیگا اُسے کوڑیوں کا لالچ ہے — طمع ہے سخت بری چیز شوق یہ سچ ہے

احمد علی شوق۔ لکھنوی۔

# یادِ اجل

"آسودگی بہ گوشۂ ہستی نہ دیدہ ایم جاں دادہ ایم و کنجِ مزارے خریدہ ایم"

میں اے اجل ہوں تیرا امیدوار کب سے! تیری مفارقت میں ہوں بے قرار کب سے!
ہے میری جان اے جاں تجھ پر نثار کب سے! کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے

مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُر زناز و نخوت۔ اے آن بان والی اے غم فروشِ عالم۔ اونچی دکان والی
اے صاحبِ عزت۔ برتر نشان والی شرم و حیا کی دیوی۔ شاہانہ شان والی

جاں تیرے خیر مقدم کو رک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اے ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھ کو
صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو آ حجرۂ لحد میں چلکر سلا دے مجھ کو

اے قبر ایک مدت سے وصل کا ہے ارماں
آغوشِ دل میں لے لے شفقت پہ تیری قرباں

میں ہوں فقط اکیلا۔ کچھ مال ہو نہ زر ہو دو گز کا اک کفن ہو۔ کچھ اپنی پاس گر ہو
کھٹکا نہ رہزنوں کا۔ چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو شادی کی کچھ خبر ہو۔ غم کا نہ کچھ اثر ہو

وہ دن کب آئینگے جب جاب رہتے ہونگے
ہم اپنا منہ لپیٹے بے فکر سوتے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا۔ دولت کی ہو نہ حاجت عزت کی ہو نہ خواہش ذلت سے ہو نہ نفرت

اعدا سے ہو نہ کینہ۔ یاروں کی ہو نہ اُلفت  اولاد کی محبت۔ ماں باپ کی نہ چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم اِن ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

کپڑا سفید سر سے پا تک تنا ہوا ہو  ڈھیلوں کا ایک تکیہ سر سے مرے لگا ہو
اور خوابہائے غفلت کا سلسلہ بندھا ہو  لیکن نہ وہ پریشاں ڈینل کے وہم سا ہو

اِس میٹھی نیند میں ہم کچھ ایسے بیخبر ہوں
غُل شور سے ہوں ایمن نالوں سے بیخطر ہوں

سبزے کی سبز چادر مرقد پہ اک چڑھی ہو  پھولوں کے بدلے جس پر حسرت برس رہی ہو
سنگِ لحد سے تصویر اک یاس کی کھڑی ہو  جائے چراغ جس پر تاریکی چھا گئی ہو

سر پیٹتی ہو حسرت اور نوحہ خواں ہو ارماں
ماتم کرے تمنا۔ ہو شوق مرثیہ خواں

سنسان مقبرہ ہو۔ ہر سو ہو ہُو کا عالم  اور لہلہا رہا ہو سبزہ کا ایک پرچم
ہر پھول داغِ غم ہو۔ ہر نخل نخلِ ماتم  آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم

تنہائی ہو محافظ خاکی مکاں کی میرے
اور بیکسی ہو درباں اِس آستاں کی میرے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت  مکار۔ بے حمیت۔ بدچشم۔ بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت  ہے بے وفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے اماں جو مانگے اُس کے گلے لگے تو
جو دل سے تجھ کو چاہے اُس سے الگ رہے تو

آمد کا اپنی مژدہ سنوائے گی یقینی  اور میری آرزوئیں بر لائے گی یقینی

۱؎ یورپ میں دستور ہے کہ اکابر اور مشاہیر ملک کی بالین قبر پہ بطور یادگار انکا بت بنا کر استادہ کرتے ہیں

آنے کو یوں تو اک دن تو آئے گی یقینی — تو آج مجھ کو لیکن ترسائے گی یقینی

رہ جاؤں گا میں کرتا اے موت تیری منت

اور تو رہے گی یوں ہی مخمورِ خوابِ راحت

محمد مسلم عظیم آبادی

# طفلِ ابر

(پہاڑ کے ایک منظر کو دیکھ کر)

وُہ دیکھو! کوہ کے پہلو سے طفلِ ابر اُٹھا! — وہ سامنے۔ ہے جہاں پیڑ یوکلپٹس کا

وہ بھاپ سا۔ وہ دھواں سا۔ وہ ملگجی سا ابر — وہ ننھا منا۔ بگولا سا۔ وہ ذرا سا ابر

وہ پیارا پیارا سا۔ وہ دلربا سا دیکھو تو — نہ دیکھا ہوگا کبھی یہہ تماشا دیکھو تو

---

اہا ہا! کھڈ میں سے اُڑ اک غبار سا نکلا — ہوا کے گھوڑے پہ بادل سوار سا نکلا

وہ پھیلا۔ اور وہ سرکا۔ بڑھا چلا کیا خوب — وہ مل کے دونوں نے ٹیلہ چھپا لیا کیا خوب

اندھیرا ہو گیا اب دھُندو کا ر بادل سے — نہاں نظر سے ہوئے کھیت سبز مخمل سے

---

وہ دیودار کے جنگل وہ فرنِ خوش منظر — بنی ہوئی تھی جو سب کوہسار کا زیور

نظر فریب جو تھیں پھول پتیاں ایلو — وہ سب دھُندلکے میں بادل کے چھپ گئیں دیکھو

وہ آسمان کا حُسنِ نظر فریب چھپا — فرازِ کوہ۔ کھڈوں کا جو تھا نشیب چھپا

وہ دل فریب سماں سب نظر سے او جھل ہے — زمین سے تا بہ فلک اب تو صرف بادل ہے

لو بھیگی بھیگی ہوا آئی مینہ برسنے لگا ! — لو بوندوں کا سر کہسار پر بندھا سہرا
لو کھڑکیوں پہ مہاوٹ کی چلمنیں چھوٹیں — لو وہ پہاڑ سے پتھر گرے سلیں ٹوٹیں
لو پانی سانپ کی مانند کوہ سے اُترا۔ — لو کھڈ کی سمت چلا بے تحاشا لہراتا
اُچھلتا۔ کودتا۔ رُکتا ہوا چلا آتا — سمٹتا۔ پھیلتا۔ جھکتا ہوا چلا آتا۔
بدلتا رنگ گھٹوں میں مچاتا شور گھسا — جھکتا۔ گرتا۔ سنبھلتا۔ دکھاتا زور گھسا

---

نکھر رہے ہیں شجر او رحجر دلہن کی طرح — پہاڑ پر ہے بہار آج کل چمن کی طرح
عروج روح کو حاصل ہے لطفِ منظر سے — یہ طفلِ ابر ابھی یونہی ٹر ہے۔ برسے

(سیّد علمدار حسین واسطی)

---

دو عزیزوں کا آج ماتم ہے — دو رفیقوں کی موت کا غم ہے
دونو سرو ریاضِ عہدِ شباب — دونو وہ آپ ہی تھے اپنا جواب
دونو نوبادہ ہائے گلشن زیست — دونو غنچہ ہائے گلشنِ زیست
دونو اُمیدوارِ عیش و نشاط — دونو اُمیدوارِ لطفِ حیات
دونو ناکام و نامرادِ ازل — دونو رنجیدگانِ دستِ اجل
دونو بیمارِ دردِ محرومی — دونو آشفتگانِ رنجوری
اِک برابر کا قوتِ بازو — اِک رفیقِ خجستہ و خوشخو
ایک جانبازِ کارزارِ جہاں — ایک بزمِ سرور و عیش کی جاں

ایک مردِ جری و عالی ہمم
اِک شکیل و حسین و والا شیم

اِک قوی تندرست و الا شان
ایک نازک حلیم جانِ جہاں

اِک متین۔ استوار۔ غیرت دار
اِک شگفتہ ظریف۔ یار و کا یار

صادق القول ایک نیکو شعار
اِک قیامت کا شوخ اور طرار

ایک بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا
ایک ناشاد جبکا چیلا ہوا

دونو پھول اپنی اپنی رنگت کے
دلربا اپنی اپنی صورت کے

دونو جرعہ کشانِ مرگِ شباب
دونو دلدادگانِ مرگِ شباب

دونو گھر بھر کو روتا چھوڑ گئے
دونو دُنیا سے منہ کو موڑ گئے

اِک نے دلہن کو نامراد کیا
دشمنوں کے دلوں کو شاد کیا

اک نے مادر کو داغِ دل بخشا
زخم اِک غیر مندمل بخشا

بھائیوں کو بلکتا چھوڑ گیا
سب سے اُلفت کا رشتہ توڑ گیا

دلِ ناشاد صبر کا ہے مقام
کس نے دُنیا میں پایا عیش آرام

اِس چمن کو ہرا بھرا دیکھا
ابھی دُنیا کا تو نے کیا دیکھا

ناشاد

مار ڈالا دوستوں کے غم نے اے مخزن ہمیں
چند دن ہیں ختم ہے اپنا بھی دورِ حیات

گھٹ گیا زورِ جوانی ہو گئے اعضا ضعیف
کون اب سر پر اٹھائے بارِ احسانِ حیات

خیریت سے جیتے جیتے ہو گئے چالیس سال
اب کہاں وہ روز و شب کہئے جنہیں جانِ حیات

کان میں آخر صدائے الرحیل آنے لگی / کچھ نہ ہمسے ہو سکا تھا جو کہ شایانِ حیات

اف رے مستی شباب اللہ رے طغیانِ شوق / خوب کی جی کھولکر سیرِ گلستانِ حیات

ذرّہ ذرّہ دفترِ مقصد تھا لیکن کیا ملا / چھان ڈالی ساری تو نے وسیع بیابانِ حیات

ہائے وہ دل نذرِ خواہشہائے بیجا کر دیا / صدر میں پیکر کے جو تھا مرتبہ دانِ حیات

فکرِ تسخیرِ بتاں اُس جذب سے ہوتی رہی / جو کہ تھا شیرازہ بندِ جزو ایمانِ حیات

یہ حواسِ ظاہری اور یہ حواسِ باطنی / شکر کے سجدے کرو جبتک ہیں مہمانِ حیات

ڈوبتا ہی نورِ آنکھوں کا برنگِ نجمِ صبح / اب تو آئینہ اُٹھا کر دیکھہ لو شانِ حیات

ہو رہی ہے یوسفِ بے کارواں منہ میں زباں / گر رہے ہیں دانت جو تھے رکنِ ایوانِ حیات

ہاتھوں کا رعشہ خبر دیتا ہے بڑھکر متصل / چھوٹنے ہی کو ہے کوئی دم میں دامانِ حیات

ضعف سے تھرا کے دونوں پاؤں دیتے ہیں خبر / آگیا نزدیک آخر وقت پایانِ حیات

ایکدن وہ تھا منو پر اپنے خوش ہوتے تھے سب / آج وہ دن ہے کہ سب ہیں مرثیہ خوانِ حیات

عقل رکھتے ہو تو قبل از مرگ مرنا خوب ہے / محشرؔ اس دنیا میں آخر کبتک ارمانِ حیات

محشر لکھنوی۔

# تازہ غزلیں

کیا قیامت ہے کہ چڑھتا ہی نہیں سے کوئی / ایکدل روز اوسے دے لاکے کہیں سے کوئی

کتنے ٹکڑے ہوئے دل کے یہ خبر کیا لیکن / دے رہا ہے مجھے چُن چُن کے زمیں سے کوئی

گر پڑا ہاتھ سے آئینہ یہہ ہم نے دیکھا / پوچھے اب اُنکے تحیر کو اونہیں سے کوئی

نازیا قہر یہہ میں کہہ نہیں سکتا لیکن / ہے وہاں تیغ بکف چینِ جبیں سے کوئی

تیری آواز میں ہستی و عدم دونوں ہیں — ہاں سے جیتا ہے تو مرتا ہے نہیں سے کوئی
اِن بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھ لیا — کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی
حُسن کا زور ستم ہے کہ اوسی کے بل پر — ہم کو چھینے لیے جاتا ہے ہمیں سے کوئی
پردۂ چشم میں پنہاں نہ ہو غمزہ اون کا — جھانکتا ہے مجھے ہر بار کہیں سے کوئی
عشق کا نام ہی بد ہے کہ بھری محفل میں — رُخ کو پھیرے ہوئے ملتا ہی ہمیں سے کوئی
دیکھ کر زخمِ جگر کھول کے لب ۔ بولا وہ — اب مزہ لے مرے حسنِ نمکیں سے کوئی

وردِ پہلو سے کھُلی شوق کیسی چوری
اُٹھ گیا ہے ابھی کچھ لے کے یہیں سے کوئی

امید سو وہ مفقود ۔ ارمان سو وہ معدوم — اے وائے دلِ مرحوم ۔ صد وائے دلِ مرحوم
طالب ہوں مگر ناکام ۔ سائل ہوں مگر محروم — تقدیر مری تقدیر ۔ مقسوم مرا مقسوم
اب دل کی نہ کچھ پوچھو ۔ اب دل کا خدا حافظ — مانوس نہ کچھ مایوس ۔ مسرور نہ کچھ مغموم
غمخوار یہ کہتے ہیں ۔ درمانِ غم آسان ہے — آثار یہ کہتے ہیں ۔ خیریتِ جاں معلوم
قربان خصوصیت ۔ کیا رسم ہے کیا ملت — الفت ہے سو وہ مشکوک نسبت ہے سو وہ موہوم
بس عذرِ خطا کب تک بس شکرِ جفا کب تک — ظاہر ہے کہ تو ظالم ثابت ہے کہ ہم مظلوم
قسمت سے وہ ملزم ہوں شامت سے وہ مجرم ہوں — جو داد سے بھی محروم ۔ بیداد سے بھی محروم
آزاد کی میخواری آزاد کا حصہ تھی ۔ — جب پی تو یہ کہہ کر پی ۔ الناد رکالمعدوم (آزاد)

تیری رنگینئے گل پیرہن ہنستی ہے گلشن پر — بہاریں لوٹتی رہتی ہیں تیرے نیچے دامن پر
سمجھتا ہی ہم آغوشِ سکوں ہمیں جمع خاطر ہوں — نظر بیطور رہے صیاد کی میرے نشیمن پر
گہے ایمائے لطفِ خاص گاہی شانِ سفا کی — قرارِ دل فدا ہے تیری تیرے نگئے چتون پر
اسیرانِ قفس سے ذکرِ گلشن کس لیئے ہمدم — ہمیں کیا گر بہار آئی تو آنکے اُٹھتے جوبن پر
نہایت حسرت سے ساقی رو دیے ہم وقتِ منو نوشی — نہیں ہے جو تری مستی کا منحصر بھادونیہ ساون پر

بھلا ہم اور تیرے مٹنے سے مٹ ہی جائینگے ہنسی آتی ہے مجھکو اے فلک اس تیرے بچپن پر

کسیکا وہ زمانہ یاد ہوگا تم کو اے بسمل
بلا ق ٹھکیلیاں کرتا تھا جب اک روئے روشن پر

عمر گذری سر کو ٹکراتے نہیں ٹوٹا قفس دیکھئے کب طائر جاں اڑکے چھوڑیگا قفس
محو قید عشق گل بلبل ہے اسکو کیا خبر تیلیاں تھیں ہائے رگ گل پھول تھا یا تھا قفس
عمر بھر بھگتی ہے اسنے حلقۂ گیسو کی قید طائر جاں کو یہی پھندا زلف پُرخم کا قفس
کس نرالے ڈھنگ سے کرتا ہے بلبل کو اسیر باغیں گلچیں بناتا ہے رگ گل کا قفس
ہجر گل میں کرتی ہے بلبل یہ نالے راتدن میں کہاں گلشن کہاں گلچیں کہاں کیسا قفس
شکوہ صیاد ستمگر کی جفا کا کیا کروں تھا ازل ہی سے مری تقدیر کا لکھا قفس

سنبلستاں میں ہے بلبل کا نشیمن آج کل
حلقۂ گیسو ہے ارشد طائر دلکا قفس

پھرتے رہے ہوس میں فدائی کہاں کہاں اور تیغ اوسکی خوں میں نہائی کہاں کہاں
دل تھا خدا کا گھر اُسے گھر اپنا کرلیا اب آپ تو کرینگے خدائی کہاں کہاں
دلکو بچاؤں یا کہ جگر کو پناہ دوں اُس شعلہ رو نے آگ لگائی کہاں کہاں
دشمن سے ملکے خرمن جاں کو جلادیا بے مہر تو نے آگ لگائی کہاں کہاں
وہ دلکو تھام لیتے ہیں ہلجاتا ہے فلک کی میری آہ نے بھی رسائی کہاں کہاں
حسن نے ازل سے تابہ ابد روپ ہی بھرا صورت بدل بدلکے دکھائی کہاں کہاں

کعبہ میں بتکدہ میں کلیسا میں اے قضا
سینے بھی اپنی شکل دکھائی کہاں کہاں

(ظہور علی مخدومی امپوری)

ملنے کا پتہ۔ ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی۔ مالک کمپنی نمبر ۱۳ کولوٹولا اسٹریٹ۔ کلکتہ